میاں داد خاں سیاح

اور ان کا کلام

مرتبہ

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو شمارہ (۲۲۳)

میاں داد خاں سیاح

اور

ان کا کلام

مرتبہ

ڈاکٹر سیّد ظہیر الدین مدنی

ایم۔ اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر اردو۔ اسمٰعیل جوگیشوری کالج بمبئی

بار اول ۱۹۵۷ء
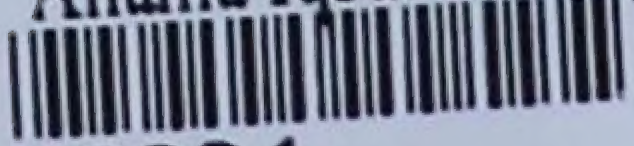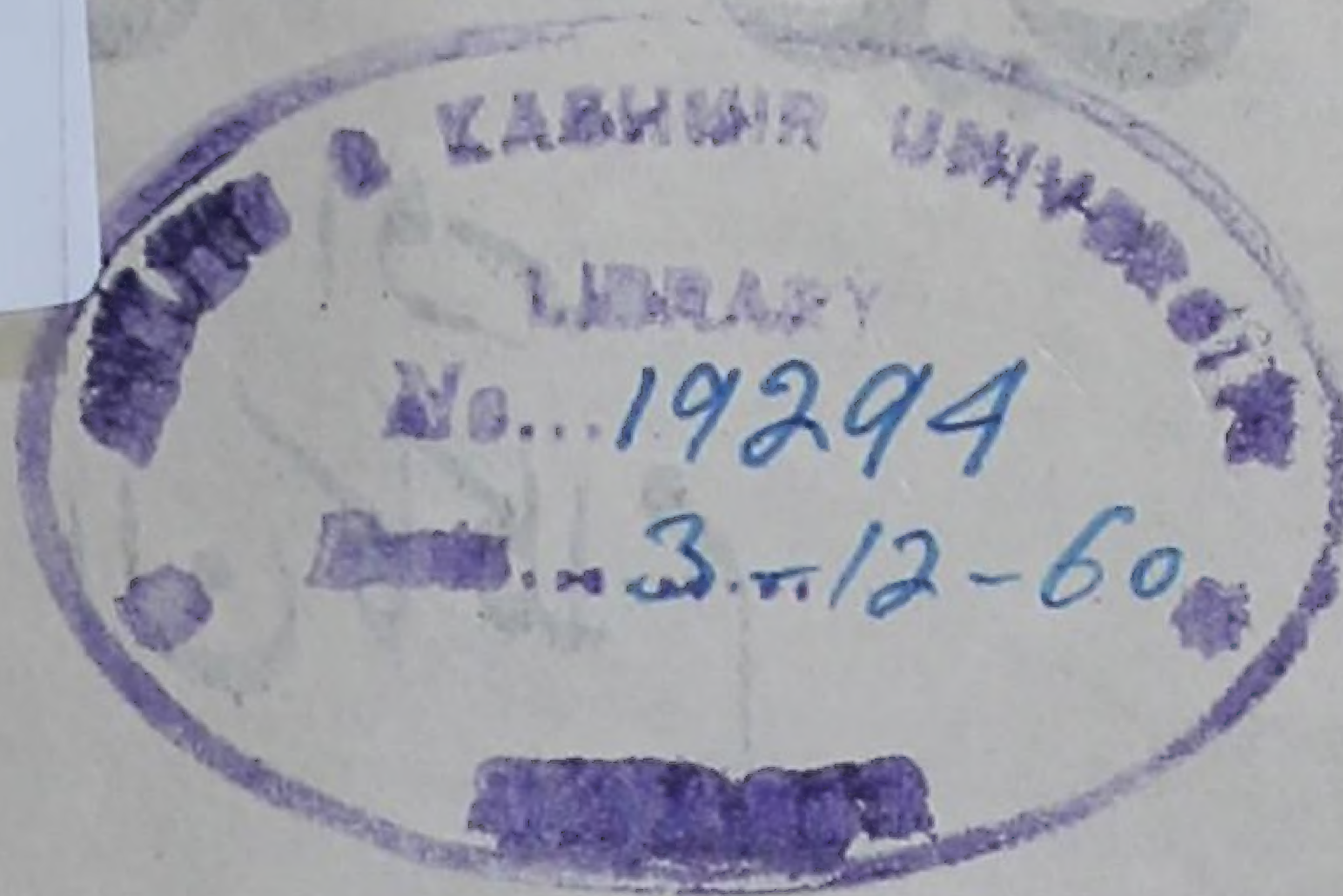
قیمت: دو روپیے

ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر
خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن

مطبوعہ
اعجاز پرنٹنگ پریس۔ حیدر آباد دکن

فہرست

میں اس کتاب کو اپنے والد مرحوم

سیّد حمید الدین سورتی جمعدار

کے نام

معنون کرتا ہوں۔

مرزا غالب کے شاگرد اور دوست میاں داد خاں سیاح
اپنے دوستوں کے ساتھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

در نفی اثبات

کریم

میاں داد خاں سیاح کی تحریر ان کے دیوان کے سرورق پر۔

پیش لفظ

منشی سیف الحق میاں داد خاں سیاح کا نام مرزا اسد اللہ خاں غالب کے شاگردوں، دوستوں اور طرفداروں میں ایک افسانوی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے کئی بار دلی اور لکھنؤ کا سفر کیا اور ہندوستان کے متعدد شہروں کی بھی سیر و سیاحت کی۔ ان کے لباس اور رکھ رکھاؤ اور طمطراق نے بڑے بڑے رئیسوں، راجاؤں اور نوابوں سے بھی ان کو روشناس کرایا۔ وہ جہاں جاتے معززین شہر اور عالموں اور دانشوروں میں قدر و منزلت پاتے اور اپنی اور اپنے استاد مرزا غالب کی شہرت اور عزت میں اضافے کا باعث بنتے۔ ان کے دوست پہلے ہی سے ان کی آمد کی تاریخ سے اپنے دوستوں کو مطلع کر دیتے تھے اور ہر جگہ ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت ہوتی۔ مشاعرے منعقد ہوتے۔ دعوتیں دی جاتیں اور رقص و سرود کے جلسے کئے جاتے۔ مشاعروں کی طرح بالعموم سیاح ہی دیا کرتے تھے اور ان کے صدر بننے کا اعزاز بھی انہی کو ملتا۔ اخباروں میں ان جلسوں اور تقریبوں کا حال چھپتا۔ خطوط شائع ہوتے اور بعض بعض وقت ان کے حاسدوں کو بھی پھلجھڑیاں چھوڑنے کا موقع ملتا۔ وہ اگرچہ یار باش، زندہ دل اور نرم دم و گرم نفس انسان تھے لیکن یہی چیزیں ہم چشموں میں بغض و حسد بھی پیدا کرتی ہیں چنانچہ بعض جگہ اور خاص کر مدراس میں اس کے مظاہرے بھی ہوئے۔

وہ جس اہتمام سے سفر کرتے اور جس طرح لٹے دیتے رہتے اس کے لئے کافی دولت اور فراغ بالی کی ضرورت تھی اور غالباً ان کے دوست احباب اور میزبان واقف نہ تھے کہ وہ دست غیب رکھتے تھے اور یہ دراصل کوئی غیبی امداد نہ تھی بلکہ انھوں نے ایک ناجائز طریقے سے اپنے شاہانہ اخراجات کی تدبیر نکالی تھی جس کا راز آخرکار فاش ہو ہی گیا اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے محققانہ صداقت سے کام لے کر اس واقعہ کو بھی اس کتاب میں خوبی کے ساتھ واضح کر دیا ہے۔

جیسا کہ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوگا سیاح اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور عنفوان شباب ہی میں سورت میں قیام پذیر ہو گئے تھے اور وہیں سے جہاں گردی کے لئے نکلا کرتے تھے۔ سورت کے ایک

نواب غلام بابا خاں کے یہاں ملازم تھے اور انہی کے توسط سے مرزا غالب ان نواب صاحب سے بھی روشناس ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے نام خطوط بھی لکھے تھے جو ان کے مجموعوں میں موجود ہیں۔

سیاح نے لارڈ ہوبرٹ گورنر مدراس کی لیڈی کو اپنے وضع قطع اور رکھ رکھاؤ سے بہت متاثر کیا تھا اور انہی کی فرمائش پر گورنر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا جس کے صلہ میں ان کو سونے کا لاکٹ عطا ہوا تھا جس پر لارڈ اور لیڈی ہوبرٹ کی تصویر منقش تھی۔ اسی عزت افزائی کے باعث مدراس کے بعض لوگ اور خاص کر احمد محی الدین صاحب ان سے جلنے لگے اور ان کے خلاف مضامین لکھے۔

ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانۂ مخطوطات میں نمبر (۵۵۵) پر ایک مدراسی شاعر غلام علی تبسم کی بیاض ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاح ۱۲۹۲ھ کے اوائل میں مدراس پہنچے تھے اور ۱۶ر محرم روز سہ شنبہ ۱۲۹۲ھ کو نواب فیروز حسین خاں کے مکان پر ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کے لئے خود سیاح نے مصرعہ طرح دیا تھا کہ ؎

"آرزوئے دل تا شاد نکل جانے دو"

اس مشاعرے کے لئے تبسم نے بھی غزل لکھی تھی اور اس میں ایک شعر خود سیاح سے مخاطب ہو کر پڑھا تھا جو یہ ہے ؎

ہیں ہوں مدراس میں سیاح کوئی صورت ہے
دلی کو لکھنو کو میری غزل جانے دو

تبسم نے فیروز حسین خاں کی تعریف میں بھی کئی قطعات لکھے ہیں جو اس مخطوطے کے ورق (۱۱۴) ب پر درج ہیں۔ مذکورہ بالا شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف مقامات کے شاعر اس وجہ سے بھی سیاح کی قدر و منزلت کرتے تھے کہ ان کی وجہ سے ان کی شہرت دور دور پہنچ جائے گی۔

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی خود سورت کے روساء اور شرفاء کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے والد بزرگوار سیاح کے دوست تھے۔ ان کے علاوہ سیاح کے اعزہ اور ان کے دیکھے ہوئے متعدد لوگوں سے وہ ذاتی طور پر واقف ہیں اس لئے اس کتاب میں جہاں انھوں نے سیاح کا دیوان محنت اور کاوش سے مرتب کر دیا ہے خود سیاح کے بارے میں بھی نہایت صحیح اور تحقیقی معلومات قلمبند کی ہیں اور بعض معلومات کا تکملہ اردو کے مشہور محقق اور ادیب جناب قاضی عبدالودود صاحب نے فرمادیا ہے۔ اس طرح سے یہ کتاب سیاح کے بارے میں ایک مستند اور جامع و مانع تصنیف ہے جس کے لئے ڈاکٹر مدنی قابل مبارکباد ہیں۔ اس کی اشاعت سے نہ صرف غالبیات میں بلکہ اردو کے تحقیقی ادب میں بھی ایک اچھا اضافہ ہوا۔

سید محی الدین قادری زور

۱۰ر جنوری ۱۹۵۷ء

دیباچہ

غالبؔ کی دل آویز شخصیت نے ایک جہاں کو ان کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ ان کے احباب و تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ان میں سے کچھ تو بجائے خود اہمیت رکھتے ہیں لیکن بہتیرے ایسے ہیں کہ اگر انھیں غالبؔ سے تعلق نہ ہوتا تو آج ان کے نام سے بھی کوئی واقف نہ ہوتا۔

گجرات کو بھی یہ سعادت حاصل ہے کہ یہاں غالبؔ کے احباب و تلامذہ موجود تھے۔ نواب سید غلام بابا خاں اور قاضی سید نور الدین شیرازی بھروچی متخلص بہ فائقؔ غالبؔ کے دوستوں میں تھے تو منشی میاں داد خاں سیاحؔ، میر ابراہیم علی وفاؔ، میر عالم علی خاں اور حکیم احمد حسن خاں مودودی کو غالبؔ سے تلمذ تھا۔

غالبؔ کے گجراتی تلامذہ میں سے سیاحؔ کا مجموعۂ کلام دستیاب ہوا ہے جسے پہلی بار منظرِ عام پر لایا جا رہا ہے۔ سیاحؔ صاحب طرز شاعر تو نہیں تھے لیکن غالبؔ کے چہیتے شاگرد ضرور تھے۔ لہٰذا بزمِ غالبؔ میں یہ اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور ان کے حالاتِ زندگی اور کلام کی اشاعت غالبیات میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سیاحؔ نے طویل عمر پائی تھی۔ اس طویل مدت میں جی بھر کے دادِ سخن بھی دی۔ ۲۱ر ستمبر ۱۸۷۳ء کے اودھ اخبار کی اطلاع کے مطابق سیاحؔ کا سرمایۂ سخن کسی میر صاحب کی بکری مسماۃ چھو پالی چبا گئی۔ آج سے اٹھارہ سال قبل سیاحؔ کے دیوان کا ایک نہایت خوش خط نسخہ راقم کی نظر سے بھی گذرا ہے جو ایسا غائب ہوا کہ آج تک لاپتہ ہے۔ یہ دیوان یقیناً اگلے مجموعے سے مختلف اور آخری عمر کی کمائی ہوگا۔ پیشِ نظر مجموعہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ یہ ایک ردیف وار انتخاب کلام ہے۔ جو سورت کے ایک قدیم و معزز خاندان کے کتب خانہ میں محفوظ پایا گیا۔ اس خاندان کے ایک فرد حکیم شیخ محمود کو سیاحؔ کے ایک قدرداں ہونے کا فخر حاصل تھا۔ حکیم صاحب موصوف کے فرزند الحاج شیخ محمد قاسم اور حکیم حافظ غلام محمد صاحب نے ۱۹۴۱ء میں راقم کو اس مجموعے سے استفادہ کرنے کا موقع دیا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں

راقم نے سیاح پر ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا جو رسالہ "اردو" بابتہ ۱۹۴۲ء جولائی میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں مذکورہ مجموعے سے بھی نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے۔

زیر بحث مجموعہ بڑی اہمیت کا الک ہے۔ چونکہ خود مصنف نے اشاعت کی غرض سے اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے اس امر کی تحریری شہادت پیش نظر مجموعہ کے سرورق پر موجود ہے۔ سیاح نے کوئی امیرالدین نامی خوشنویس سے یہ انتخاب کلام لکھوایا لیکن سیاح کو اس کی کتابت پسند نہیں آئی۔ لہٰذا اس مجموعہ کے سرورق کے حاشئے پر کاتب کی فروگذاشتوں اور خط کے متعلق سیاح نے دو چار فقرے قلمبند کئے ہیں۔ اسی ورق کے حاشئے میں امیرالدین کی تحریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب مذکورہ مجموعہ دوبارہ ان کے پاس پہنچا تو امیرالدین نے اس کو سیاح کی ہدایت کے مطابق لکھنے کے بجائے کوئی مولوی امجد حسین صاحب سے کتابت کا مشورہ لکھ کر مجموعہ لوٹا دیا۔ سرورق کا عکس یہاں دیا جاتا ہے۔ اس کو دیکھنے کے بعد حقیقت واضح ہو جائے گی۔

اس مجموعے میں ترانوے غزلیں اور تین سہرے ہیں۔ غزلیات ردیف دار ہیں۔ بعض جگہ درمیان میں سادہ ورق چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ سیاح کچھ غزلوں کا اضافہ کرنے والے ہوں گے۔ ردیف الف کے اختتام پر تین سہرے ہیں جو مختلف تقاریب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مخطوطے میں تین مقامات پر کسی لامعلوم شخص نے اپنی پسند کے دوسرے شعرا کے چند اشعار لکھ دیئے ہیں اور ان کے نیچے ایک جگہ کلکتہ سنہ ۱۹۱۰ء اور دوسری جگہ کلکتہ سنہ ۱۹۱۱ء لکھا ہوا ہے۔ ان اشعار میں داغ اور جلال کے بھی دو ایک شعر پائے جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ نہ سیاح کے اشعار ہیں نہ سیاح یا امیرالدین کا خط ہے۔ مجموعے میں تین غزلوں پر سیاح نے صاد کر کے لفظ استاد لکھ دیا ہے ممکن ہے اس سے اپنے استاد کی پسند کی طرف اشارہ ہو۔

سیاح کے حالات زندگی کسی جگہ نہیں پائے جاتے۔ اس کے مآخذ چار قسم کے ہیں۔ (۱) تذکرے اور دیگر تصانیف۔ (۲) خطوط غالب۔ (۳) خود سیاح کی تصانیف۔ (۴) اور ان بزرگوں کے بیانات جنھیں سیاح کی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔ پانچ تذکروں میں سیاح کا ترجمہ نظر سے گذرا۔ ان میں سے صرف خمخانۂ جاوید میں کسی قدر تفصیل سے حالات ملتے ہیں۔ ادبی خطوط غالب میں بھی جناب مرزا محمد حسن عسکری نے کچھ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ خطوط غالب اس امر میں بہت مفید مطلب ثابت ہوئے۔ سیاح کی ایک تصنیف "سیر سیاح" سے بھی ان کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اودھ اخبار اور کشف الاخبار بمبئی کے فائل بھی سیاح کے بعض حالات سفر و حضر کے متعلق مستند شہادتیں پیش کرتے ہیں۔ ان مآخذ کے علاوہ راقم کے والد سید حمیدالدین صورتی جمعدار مرحوم اور حکیم شیخ محمد قاسم نے سیاح کے متعلق بہت اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان بزرگوں کے بیانات اس لئے قابل وثوق سمجھے گئے ہیں کہ ان دونوں میں سے اول الذکر کو سیاح کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کا فخر حاصل ہے اور موخرالذکر نے سیاح کو اپنے بچپن میں بہت قریب سے دیکھا ہے۔

اس کتاب کے مقدمے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب کتابیات سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا باب نام، وطن، تعلیم، سیر و سفر، وفات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ تیسرا باب سیاح کی تصانیف کے بیان میں ہے اور چوتھا باب تنقید و تبصرہ سے متعلق ہے۔ اس کے بعد تکملہ ہے جسے میرے کرمفرما قاضی عبدالودود صاحب بار ایٹ لا نے اودھ اخبار کی قدیم مجلدات کے کئی ہزار صفحات کی ورق گردانی اور دیدہ ریزی کے بعد لکھا ہے تاکہ حتی الامکان اس کتاب کی تکمیل ہو سکے۔ قاضی صاحب کی اس ادبی اعانت کی عدم موجودگی میں زیر بحث تصنیف کسی حالت میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ تکملہ کے بعد کلام سیاح ہے۔ اختلافات کی فہرست کلام کے آخر میں دی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں دو ضمیموں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ پہلے ضمیمہ میں وہ خطوط غالب ہیں جن سے سیاح کے حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسرے ضمیمے میں پانچ خاندانوں کے بہت مختصر حالات پیش کئے گئے ہیں۔ یہ وہ علمدوست خاندان ہیں جن سے سیاح کو کسی نہ کسی قسم کا تعلق رہا ہے۔ مقدمے میں بعض جگہ ان کے حوالے بھی آتے ہیں۔ یہ صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ جگہ جگہ طول طویل فٹ نوٹس لکھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ کتاب میں سیاح کی تصویر کا عکس بھی دیا گیا ہے۔ اس عکس میں حکیم شیخ محمود میاں اور حکیم عبدالرزاق رامپوری (استاد حکیم شیخ محمود) بھی موجود ہیں۔

میں جناب حکیم محمد قاسم صاحب، ان کے چھوٹے بھائی حکیم حافظ غلام محمد صاحب اور مینیجر دواخانہ معین الصحت شیخ عبدالقادر صاحب کا ممنون ہوں کہ ان حضرات نے سیاح کا کلام، حالات اور تصویر عنایت کر کے سیاح کی ادبی کاوشوں کو منظر عام پر لانے کا موقع دیا۔ جناب قاضی عبدالودود صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ موصوف نے اس کتاب کی تیاری میں علمی اعانت اور مفید مشوروں سے قدم قدم پر میری رہبری کی ہے۔ اس موقع پر جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب (کارپوریٹر) جنرل سکریٹری انجمن اسلام بمبئی و پرنسپل صابو صدیق ٹکنیکل ہائی اسکول کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر موصوف اصرار نہ کرتے تو شاید یہ کتاب اس وقت منظر عام پر نہ آتی۔

بمبئی۔ یکم مئی ۱۹۵۶ء

سید ظہیرالدین مدنی

مقدمہ

کتابیات

تذکروں سے سیاح کا ترجمہ

خمخانۂ جاوید ــــ سیاح

شاعرِ خوش فکر و عالی طبیعت۔ منشی میاں داد خاں اورنگ آبادی مقیم سورت، آپ کے والد ماجد منشی عبد اللہ خاں اورنگ آباد کے نامی رئیس تھے۔ یہ پیدا ہوئے تو گھر دولت سے بھرپور تھا۔ آپ نے ناز و نعم کے گہوارے میں پرورش پائی مگر لڑکپن کی حد سے باہر قدم نکالا تو گھر کا اقبال رخصت ہو چکا تھا لیکن زندہ دلی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شوخی، ظرافت، بذلہ سنجی اپنے ساتھ لائے تھے۔ ذہین طباع انسان تھے۔ آخرکار میر غلام بابا خاں کے سی ایس آئی رئیس اعظم سورت بندر کے مصاحب رفیق ہو گئے۔ اوائلِ مشقِ سخن میں عشاق تخلص تھا۔ ۱۸۶۴ء میں میرزا نوشہ غالب دہلوی کی خدمت میں دہلی حاضر ہو کر غزل بنظرِ اصلاح پیش کی۔ میرزا صاحب نے سیاح تخلص اور سیف الحق لقب عنایت فرمایا اور یہ عالمِ سخن میں بادیہ پیما ہوئے۔ مرزا غالب کو ان سے دلی اُنس تھا۔

سیاح تخلص رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اطرافِ ہندوستان، پنجاب، بنگالہ، کشمیر کے سوا عرب اور عجم کے نظارے بھی آنکھ سے دیکھے تھے۔ فارسی زبان خوب جانتے تھے۔ طبیعت چلتی ہوئی تھی۔ عقل و دانش ضمیر میں داخل تھی اس لئے بعض لوگ ان پر سرکاری جاسوس ہونے کا شبہ کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ ذہانت اور طباعی حدِ اعتدال سے تجاوز ہو کر دائرۂ قانون سے باہر ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ ۱۸۸۱ء میں ان پر مقدمہ قلب سازی قائم ہوا اور گرفتار ہو کر سزایاب ہوئے۔

منشی نولکشور سے ان کا بڑا یارانہ تھا اور وہ خمدوست ہونے کے باعث ان کی قدر کرتے۔ لکھنؤ، دہلی، کانپور میں جب کبھی جاتے تو خود مصرعِ طرح دے کر مشاعرے کرتے۔ کسبِ کمال کا ذوق قدرت سے ان کی طبیعت میں ودیعت تھا اور اس بناء پر میرزا غالب کو ان سے خاص اُنس تھا۔ عود ہندی میں

جو رقعات ان کے نام ہیں ان میں فقرے فقرے سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اول تو آپ کی سورت دکن کی پیدائش پھر اس زمانہ میں ریلوے کا سلسلہ رسل و رسائل بھی نہ تھا مگر اس شوق کی داد دیجئے کہ کئی بار میرزا کے فیض صحبت سے مستفیض ہونے دہلی آئے اور ان سے نکات شاعری حاصل کئے۔ نکتہ سنجی معنی یابی ان کی بات بات میں تھی۔ پڑھنے کا انداز نہایت دلفریب تھا۔ جس مشاعرے میں جاتے اپنا رنگ جما لیتے۔ زبان صاف تھی۔ برجستگی سے محاوروں کو نظم کرتے۔ میرزا غالب کے خرمن فیض کی خوشہ چینی سے شاعر کامل بن گئے تھے۔ مضمون آفرینی میں چابک و چوبند، اسلوب بیان دل پسند تھا۔ ۱۹۰۷ء میں (۷۰) برس کی عمر پا کر منزل حیات کو قطع کیا۔ سیر سیاح، لطائف غیبی ان کی تصنیف ہے۔ آخر الذکر کتاب کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ میرزا کے قلم سے نکلی ہے مگر ان کے نام سے شائع کر دی گئی۔ ایک دیوان ریختہ بھی ان سے یادگار ہے۔ ان کی بقائے دوام قائم رکھنے کو وہ خطوط ہیں جو اردوئے معلیٰ میں میرزا صاحب نے ان کے نام لکھے ہیں۔ افسوس ہے کہ میرزا صاحب کے ایک عزیز شاگرد ۱۹۰۶ء تک زندہ رہا مگر اس پہ گمنامی کی نقاب پڑی رہی۔ نہ اردو کی انجمنوں اور کانفرنسوں میں اس کی آواز سنائی دی نہ رسائل و اخبارات اس کو ملک کے سامنے لائے نہ اس کا دیوان ارباب سخن تک پہنچا۔ صرف راقم تذکرہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کی لوح لگائے۔ اسے انجمن سخن میں نمایاں کرے۔ بکمال جستجو و جانفشانی سے حالات و کلام فراہم کیا۔ نتیجۂ فکر یہ ہے:—

نمونۂ کلام

کرتے ہیں وہ باتیں کہ مری جان پہ بن جائے — بگڑے ہوئے کچھ آتے ہیں بہکائے ہوئے ہیں
آئے ہیں عیادت کے لئے غیر کے ہمراہ — ساتھ اپنے مری موت کو بھی لائے ہوئے ہیں
غصہ ہے ترے چہرۂ زیبا سے عیاں ہے — وہ شعلے جو اغیار کے بھڑکائے ہوئے ہیں

جس شخص کے پہلو میں نہ دل ہو نہ جگر ہو — پھر کیا اسے تیر نگہ یار سے ڈر ہو
دل کو تو لئے بیٹھے ہو اب چاہتے کیا ہو — لو جان بھی حاضر ہے اگر مد نظر ہو
کیا لیتے ہو دل یہ تو ہزاروں نے دیا ہے — وہ کیجے طلب ہم سے نہ جو حد بشر ہو
آتش ہے جہاں سوز یہ رہ جائے ٹھٹھر کر — اس سینۂ سوزاں کے مقابل میں اگر ہو
آیا ہے عجب طور کا یہ دور زمانہ — جو عیب ہے دنیا میں وہ مشہور ہنر ہو

قمریوں پہ نہ دم سیل بلا نازل ہو — باغ میں کھولو نہ تم زیر صنوبر گیسو
بس اسی خبط میں کٹتے ہیں مرے لیل و نہار — چہرہ دن بھر ہے تصور میں تو شب بھر گیسو
بوسہ اس رخ کا لئے وصل میں کیا اے سیاح — چھا گئے ایسے کہ ہیں سد سکندر گیسو

کہدو سنبھل کے میکدے میں آئے محتسب
ٹوٹیں گے خم ضرور مگر اس کے سر کے ساتھ

ہوتے ضرور تیرے ثنا گر پہ کیا کریں
قاتل دہان زخم کی گویا زباں نہ تھی

مشتعل ہے بزم میں شعلہ جو اس کے حسن کا
شمع پہ دانوں سے جویائے پر پروانہ ہے

سیاح کیوں نہ کیجئے نظارۂ بتاں
لایا ہے شوق جانب ہندوستاں مجھے

منور گھر ہے اپنا شمع رو سے آج خلوت ہے
جلے کیوں کر نہ پروانہ یہ اپنی اپنی قسمت ہے [1]

پڑ گیا ہے اس کو چسکا چاٹ کر کس کا لہو
اگلی ہی پڑتی ہے جو تلوار اس خونخوار کی

دل وحشی کا بھی کیا کارخانہ لاابالی ہے
زر داغ جنوں کا خرچ ہے سرکار عالی ہے

نہ رکھتے سرکشی سے تھے زمیں پر جو قدم اپنے
نصیب ان کو بسان نقش قالیں پائمالی ہے

پھرا کرتا ہوں گرد اس کے نہیں تاب ہم آغوشی
میں ہوں تصویر اور وہ شمع فانوس خیالی ہے

جو ہیں واردان مضموں مثل مضمون باندھے جائینگے
کہ اب سیاح کو شہر سخن کی کوتوالی ہے

کوئی تم صیاد ادھر پھر شکار آتا ہے
طائر دل قفس تن میں جو گھبراتا ہے

ہجر میں موت بھی آئی نہ مجھے سچ ہے مثل
وقت پر کون کسی کے کوئی کام آتا ہے

مژدہ اے دل کہ مسیحا نے دیا صاف جواب
اب کوئی دم میں لبوں پہ مرے دم آتا ہے

سخت پچھتاتے ہیں ہم دے کے دل ان کو سیاح
اپنی افسوس جوانی پہ ہمیں آتا ہے

قفس میں سیر گلشن کی اگر مانگے دعا دل سے
صدائے خندۂ گل آئے فریاد عنادل سے

سخن شعراء

سیاح تخلص میاں داد خاں اورنگ آبادی ولد عبداللہ خاں شاگرد غالب۔ اطراف عرب و عجم و ہندوستان کی سیر کی تھی۔ ۱۸۶۲ء میں آئے تھے۔ ان دنوں سورت میں رہتے ہیں۔ شعر اچھا کہتے ہیں۔ راقم کے احباب میں ہیں۔ یہ شعر اس تذکرہ کے لئے دیئے تھے۔

آیا نہ یار وعدے پہ سیاح صبح تک
کیا کیا شب فراق میں تڑپی بدن میں روح

عبث جاتا ہے کعبہ کو خدا نزدیک ہے دل سے
تو کیا نادان ہے زاہد فائدہ تحصیل حاصل سے

نہ دیکھیں گے قدم غیرت کے مارے غیر واں ہرگز
نہ گڑوائیں اٹھا کر لاش میری کوئے قاتل سے

---

[1] ابتدائی تین اشعار سیاح کے مجموعۂ کلام میں نہیں ہیں۔ مرزا عسکری نے بھی یہ اشعار دیئے ہیں۔ ممکن ہے خم خانۂ جاوید ہی سے لئے ہوں۔ اسی طرح شعر ۹، ۱۰، ۱۱ بھی موجود نہیں۔

دل وحشی کا بھی کیا کارخانہ لاابالی ہے
زر داغ جنوں کا خرچ ہے سرکار عالی سے

کہوں گر جان تو سمجھے کہ ہم کو بے وفا سمجھا
سمجھ اس بدگماں کی ساری دنیا سے نرالی ہے

پھرا کرتا ہوں گرد اس کے نہیں تاب ہم آغوشی
میں ہوں تصویر اور وہ شمع فانوس خیالی ہے

ہوئے در در ترے ثنا خواں یہ کیا کریں
قاتل دہان زخم کی گویا زباں نہ تھی

پڑ گیا ہے اس کو چسکا چاٹ کر کس کا لہو
اگلی ہی پڑتی ہے جو تلوار اس خونخوار کی

آتش قدم ایسا ہوں جو بیٹھوں تو زیادہ
ہو دھوپ سے بھی سایۂ دیوار میں گرمی

مشتعل ہے بزم میں شعلہ جو اس کے حسن کا
شمع پروانوں سے جویائے پر پرواز ہے

بارے اتنا تو اثر نالۂ بلبل نے کیا
نظر آتا ہے ہر اک گل ہمہ تن گوش مجھے

بچھاتا خار غم ہے واں جہاں بستر لگاتا ہوں
کھٹکتی میرے دو دن کی فلک کو زندگانی ہے

عدم کا کیوں کیا ثابت وجود اہل سخن بھولے
نہ دینی تھی عدم کے ساتھ تشبیہ دہن بھولے

بزم سخن

میاں داد خاں ابن عبداللہ خاں تلمیذ غالب دہلوی باشندۂ اورنگ آباد عمرہا بہ سیر و سیاحت ماندہ مدتہا بر فاقت نواب غلام بابا رئیس سورت بسر بردہ گویند کہ بعلت جرم دائم الحبس گردیدہ۔ طبع شگفتہ دارد از وست:۔

عبث جاتا ہے کعبہ کو خدا نزدیک ہے دل سے
تو کیا نادان ہے زاہد فائدہ تحصیل حاصل ہے

کہوں گر جان تو سمجھے کہ ہم کو بے وفا سمجھا
سمجھ اس بدگماں کی سارے عالم سے نرالی ہے

بچھاتا خار غم ہے واں جہاں بستر لگاتا ہوں
کھٹکتی میری دو دن کی فلک کو زندگانی ہے

سراپا سخن

میاں داد خاں سیاح خلف عبداللہ خاں باشندۂ اورنگ آباد دکن۔ پہلے مشتاق تخلص کرتے تھے۔ جب مرزا غالب کے شاگرد ہوئے سیاح تخلص پایا۔
نمونۂ کلام :۔ غزل ص ۲۵۔

ادبی خطوط غالب۔ ص ۲۸۰

نام میاں داد خاں اور سیف الحق لقب تھا جو مرزا غالب نے عطا فرمایا تھا۔ جیسا کہ مرزا خود اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "یہ جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو۔ تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی"۔ اصل میں اورنگ آباد کے رہنے والے تھے مگر سورت میں مقیم تھے۔ آپ کے والد ماجد منشی عبداللہ خاں اورنگ آباد کے ذی مقدرت رئیس اور مشہور و معروف شخص تھے۔ جب سیاح پیدا ہوئے تو دولت و اقبال کی فراوانی تھی۔ عزت و حشمت خاندانی کا ستارہ چمک رہا تھا۔ مگر افسوس کہ جب تک یہ سن شعور کو پہنچے گردش زمانہ نے وہ سب مٹا دیا اور افلاس و ادبار و نکبت نے گھر گھیر لیا۔ مجبوراً انھیں ترک وطن کرنا پڑا اور سورت چلے آئے اور

نواب سیر غلام بابا خاں رئیس اعظم سورت کے زمرۂ مصاحبین میں داخل ہوئے۔ سیاح خطاب مرزا غالب نے اس واسطے ان کو دیا تھا کہ وہ علاوہ مشہور ہندوستان کے شہروں کے دوسرے ممالک ایران و عرب و مصر وغیرہ کی سیر کر آئے تھے۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں دلی آکر مرزا سے ملاقات کی اور عرصے تک مقیم رہے اور اسی طرح کئی مرتبہ سورت سے دلی تک آئے۔ اس زمانے میں نہ ریل تھی نہ سفر کی اس قدر آسانیاں تھیں مگر وہ برابر سفر کرتے رہتے تھے۔

شعر و شاعری کے نہایت دلدادہ تھے اور ابتدا میں عشاق تخلص کرتے تھے۔ مرزا صاحب نے اس تخلص کو بدل کر سیاح تخلص رکھا۔ سیاح کو فارسی میں درجۂ کمال حاصل تھا۔ نہایت بے تکلفی کے ساتھ اس زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ نہایت عقلمند اور حکام رس تھے۔ بعض لوگ ان کو سرکاری جاسوس سمجھا کرتے تھے جہاں کہیں جاتے اور کچھ دن وہاں قیام کرتے تو مصرعہ طرح خود دیتے اور وہاں مشاعروں کی بنیاد ڈالتے تھے اور داد سخن دیتے تھے۔ پڑھنے کا ایسا اچھا انداز تھا کہ سننے والے محو ہو جاتے تھے۔ ہر مشاعرے میں یہ اپنا رنگ جما لیتے تھے۔

افسوس ہے کہ ۱۸۸۰ء میں ان کے اوپر مقدمہ قلب سازی قائم ہوا اور گرفتار ہو کر سزایاب ہو گئے۔ مرزا سے ان کو اور ان سے مرزا کو ایک خاص خلوص اور انس تھا۔ چنانچہ قاطع برہان کی تائید میں ایک رسالہ لطائف غیبی اغلول نے لکھا ہے جس کی مرزا نے خود تعریف کی ہے اور انھیں لکھا ہے کہ لطائف غیبی نے اعدا کی دھجیاں اڑا دیں۔ آزاد مرحوم کو یہ شبہ ہے کہ مرزا ہی کا لکھا ہوا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ مرزا جابجا ان کی لیاقت کی تعریف کرتے ہیں اور کہیں ان کو منع کرتے ہیں کہ اب کچھ ایسا نہ لکھنا۔ مرزا سے ان کے تعلقات اس درجہ تھے کہ خاص یگانگت اور دوستی میں بھی نہیں ہوسکتے۔

مرزا کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کو نور چشم، برخوردار، بیٹا کر کے خطاب کرتے تھے اور سیاح کا بھی یہ رنگ تھا کہ قلمی مالی غرضیکہ ہر قسم کی مرزا کی اعانت کرتے رہتے۔ کبھی روپیہ، کبھی ہنڈی کبھی کچھ کبھی کچھ برابر بھیجتے رہتے تھے۔ مرزا کی ملاقات صوری چونکہ بیشتر سیاح کو میسر نہ تھی اس لئے خواہش کی تھی کہ آپ اپنی تصویر بھیج دیجئے۔ مرزا نے جو بعد میں لکھا "صاحب! کیوں اس بڑھاپے میں تصویر کے پردے میں کھنچا کھنچا پھروں۔ گوشہ نشیں آدمی عکس کی تصویر اتارنے والے کو کہاں ڈھونڈوں۔ دیکھو ایک جگہ میری تصویر بادشاہ کے دربار میں کھنچی ہوئی ہے۔ اگر ہاتھ آجاوے گی تو وہ ورق بھیج دوں گا۔

سیاح نہایت بلند پایہ اور پر گو شاعر تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور آخر وقت تک مشق سخن جاری تھی مگر افسوس کہ جس قدر ان کی شہرت ہونا چاہیے تھی نہ ہوئی آخر کار اسی گوشہ گمنامی میں (۷۰) برس کی طویل عمر پاکر بمبئی میں ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا۔ "سیر سیاح" ان کی ایک مشہور تصنیف ہے جس میں اپنی سیر و سیاحت کا حال درج کیا ہے۔
نمونۂ کلام یہ ہے :-

کرتے ہیں وہ باتیں کہ مری جان پہ بن جائے — بگڑے ہوئے کچھ آئے ہیں بہکائے ہوئے ہیں
آئے ہیں عیادت کے لئے غیر کے ہمراہ — ساتھ اپنے مری موت کو بھی لائے ہوئے ہیں
غصہ ہے ترے چہرۂ زیبا سے عیاں ہے — وہ شعلے جو اغیار کے بھڑکائے ہوئے ہیں

کہدو سنبھل کے میکدے میں آئے محتسب — ٹوٹیں گے خم ضرور مگر اس کے سر کے ساتھ

ہوتے ضرور تیرے ثنا گر پہ کیا کہیں — قاتل دہان زخم کی گویا زبان نہ تھی

پھرا کرتا ہوں گرد اس کے نہیں تاب ہم آغوشی — میں ہوں تصویر اور وہ شمع فانوس خیالی ہے

قفس میں سیر گلشن کی اگر مانگے دعا دل سے — صدائے خندۂ گل آئے فریاد عنادل سے

کتابیات

کتاب	مصنف	زبان	مطبع
خمخانۂ جاوید	لالہ سری رام	اردو	جلد پنجم
سخن شعراء	عبدالغفور نساخ	اردو	مطبع منشی نولکشور ۱۸۷۴ء
بزم سخن	سید علی خاں صدیق حسن خاں	فارسی	مفید عام پریس آگرہ
سراپا سخن	سید محمد محسن علی	اردو	۱۸۹۸ء
آب حیات	مولانا محمد حسین آزاد	اردو	مبارک علی لاہور
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ مترجم عسکری	اردو	نولکشور پریس لکھنو
گل رعنا	حکیم عبدالحی	اردو	مطبع معارف - اعظم گڈھ
سخنوران گجرات	سید ظہیرالدین مدنی	اردو	مخطوطہ۔ تذکرۂ شعرائے گجرات
یادگار غالب	مولانا الطاف حسین حالی	اردو	لاہور
تلامذۂ غالب	مالک رام	اردو	رسالہ اردو
غالب	غلام رسول مہر	اردو	
ادبی خطوط غالب	مرزا محمد عسکری	اردو	انوار المطابع لکھنو ۱۹۳۲ء
اردوئے معلیٰ		اردو	لاہور ایڈیشن
اردوئے معلیٰ		اردو	رام نرائن ایڈیشن
اردوئے معلیٰ		اردو	مطبع نامی ۱۸۷۴ء
عود ہندی		اردو	

خطوط غالب	مہیش پرشاد	اردو	
غالب نامہ	شیخ محمد اکرام	اردو	مرکنٹائل پریس لاہور ١٩٣٦ء
سیر سیاح	منشی میاں داد خاں سیاح	اردو	مطبع نولکشور ١٨٧٢ء
لطائف غیبی	" " "	اردو	اکمل المطابع دہلی ١٨٦٤ء
شہر آشوب	" " "	اردو	مخطوطہ
بمبئی گزیٹیر۔ سورت، بھروچ، بڑودہ	مرتبہ کیمبیل	انگریزی	قدیم ایڈیشن
کمرشل پالیسی آف دی مغلز	ڈی، پی، پنتھ	انگریزی	
بڑودہ کے سلہ دار سرداروں کی تاریخ		مرہٹی	مرتبہ حضور کچہری، بڑودہ ١٨٨٩ء
بڑودہ نواب خاندان کی تاریخ		گجراتی	نظامی پریس احمد آباد
تاریخ گجرات	سید عبد الرحمن جیوا میاں عیدروس	اردو	مخطوطہ ١٨٨٥ء
حقیقت السورت ـ تاریخ بزرگان سورت	شیخ بہادر بخش ـ مرتبہ معلم عبد المنعم باحافظ	فارسی	بمبئی ١٣١٥ھ
علیگڑھ میگزین ـ غالب نمبر		اردو	علیگڈھ
دہلی کا دبستان شاعری	ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی	اردو	
لکھنو کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابو اللیث	اردو	
خود نوشتہ سوانح عمری	منشی لطف اللہ فریدی۔ مرتبہ کپتان ایسٹ وک	انگریزی	لندن ١٨٥٨ء
کشف الاخبار (بمبئی)		اردو	١٨٧٥ء ـ ١٨٧٦ء بمبئی
اودھ اخبار			١٨٧٣، ٧٤، ٧٥، ٧٦ء
معاصر حصہ (٤)	تکملہ از قاضی عبد الودود	اردو	
	مضمون غالب کے گجراتی احباب از سید ظہیر الدین مدنی		پٹنہ
رسالہ اردو	مضمون سیاح از سید ظہیر الدین مدنی		بابتہ جولائی ١٩٤٢ء

منشی میاں داد خاں سیاح

منشی سیاح کا نام میاں داد خاں اور اصل وطن اورنگ آباد تھا۔ ان کے والد عبداللہ خاں اورنگ آباد کے باعزت اور آسودہ حال باشندوں میں تھے۔ سیاح کا سنہ ولادت ان کی عمر اور سنہ وفات کے پیش نظر ١٨٣٠ء قیاس کیا جاسکتا ہے[1]۔ سیاح کے سن شعور کو پہنچنے تک ان کا خاندان گردش روزگار کے چکر میں پھنس چکا تھا۔ جب انھیں اپنا وطن تیرہ و تار نظر آنے لگا تو پندرہ سولہ سال کی عمر میں وطن مالوف کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر ١٨٤٥ء سے ١٨٤٧ء کے درمیان سورت پہنچے[2]۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ سیاح دکن سے ہجرت کر کے قسمت آزمائی یا اکتساب علم کے خیال سے سورت آئے کیونکہ اس زمانے کا سورت دونوں حیثیتوں سے اہم مرکز تھا۔ ایک طرف سورت کی علمی، ادبی فضا اور دوسری طرف بیرونی ممالک سے اس کے تجارتی تعلقات کی بناء پر باہر سے آنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ سورت کو اس زمانے میں وہی حیثیت حاصل تھی جو آج شہر بمبئی یا دہلی کو نصیب ہے۔ غرض سیاح کسی نیت سے سورت آئے ہوں اس منزل پر ولبستگی کے سامان مہیا ہو گئے اور یہاں انھوں نے مستقل اقامت اختیار کر لی۔

سیاح کے ابتدائی دور کے حالات سے ہم لاعلم ہیں لیکن جہاں تک ان کی تعلیم و تربیت کا تعلق ہے یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے اپنے وطن میں ہی ہوئی ہوگی اور یہ قرین قیاس ہے کہ سورت کے علمی ماحول کے پیش نظر سلسلۂ تعلیم جاری رکھا ہوگا چونکہ ورود سورت کے وقت ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔

سیاح نے سورت کو ثانی وطن تو بنا لیا تھا لیکن شوق سیاحت نے انھیں ہمیشہ وطن کی قید سے آزاد رکھا۔ سورت آنے کے بعد کسی طرح موقع مل گیا اور یہ عرب و عجم کی سیر کے لئے چل پڑے۔ اپنی ایک تصنیف "سیر و سیاح" میں اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"سیر وافی الارض نے دل تماشا گداز کو گدگدایا۔ ادھر جوانی ولولہ جوش ادھر خود کاوی جلوہ فروش سیر جزائر عرب و عجم نے بے پر اڑایا"[3]

---

[1] سیاح کی عمر (۸۵) سال تھی اور ان کا انتقال ١٩٠٧ء میں ہوا۔ اس حساب سے ان کا سنہ ولادت ١٨٣٠ء قیاس کیا گیا ہے۔

[2] میر غلام بابا خاں کے پوتے میر حفیظ الدین خاں، سید حمید الدین سورتی جمعدار اور حکیم محمد قاسم کا بیان ہے۔

[3] محققین کا خیال ہے کہ لطائف غیبی دراصل غالب کی تصنیف ہے جو سیاح کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ یقینی ہے کہ سیاح نے اپنی سیر و سیاحت کا احوال غالب کو سنایا ہوگا۔

انتہا ہی نہیں بلکہ اسی دوران سیاحت بنگالہ، دکن، پنجاب، وسط ہند، سندھ، کابل، کشمیر، قندھار وغیرہ دیکھ آئے۔ لطائف غیبی میں یہ فقرہ ملتا ہے:۔

"میں نے بعد تحصیل علوم رسمیہ سیاحت اختیار کی۔ بنگالہ، دکن، پنجاب، وسط ہند، بلاد و قرا کے کہاں تک نام لوں قلمرو ہند میں سرتا سر پھرا ہوں بلکہ سندھ و کابل و کشمیر و قندھار بھی دیکھ آیا ہوں۔"[۴]

یہ زمانۂ سیاحت جو بارہ [۱۲] سال سے کم نہ ہوگا ۱۸۴۶ء سے ۱۸۶۰ء کے درمیان کا ہے۔ اسی دوران سفر میں منشی صاحب کو غالب سے نیاز حاصل کرنے کا موقع میسر آیا۔[۵]

۱۸۶۰ء میں یہ ستارہ لکھنؤ کے افق پر نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کی ویرانی و تباہ حالی سے سیاح نے متاثر ہو کر اپنے استاد کو اس مقام سے ایک خط لکھا ہے جس کے جواب میں غالب نے بھی اظہار افسوس کیا ہے۔[۶] لکھنؤ سے یہ بنارس گئے۔[۷] بنارس میں نہ جانے کتنا قیام رہا اور کہاں کہاں گئے لیکن ۱۸۶۱ء کے اکتوبر کے مہینے میں سیاح کلکتے میں پائے جاتے ہیں[۸] اور ۱۸۶۲ء اپریل یا مئی میں سورت پہنچتے ہیں۔ سورت پہنچنے پر غالب نے انھیں لکھا ہے:۔

"سورت کا پہنچنا بہر صورت مبارک ہو۔"[۹]

سیاح کا سورت پہنچنا واقعی مبارک ثابت ہوا۔ سفر سے لوٹنے کے بعد ان کی رسائی نواب میر غلام بابا خاں کے دربار میں ہوئی اور نواب موصوف کے زمرۂ مصاحبین میں شامل کر لئے گئے۔ سیاح نے اپنے استاد کو یہ خوش خبری لکھ بھیجی ہوگی اور نواب صاحب کی تعریف میں کچھ لکھا ہوگا جس کے جواب میں غالب ۱۸۶۲ء کی ۱۷ر جون کو لکھتے ہیں:۔

"میر غلام بابا خاں واقعی ایسے ہی ہیں جیسا تم لکھتے ہو۔ سیاحت میں دس ہزار آدمی تمہاری نظر سے گذرا ہوگا۔ اس گروہ کثیر میں جو تم ایک شخص کے مداح ہو تو بے شک وہ ہزاروں میں ایک ہے۔"[۱۰]

سیاح نے اس خط کے ذریعہ غالب سے غلام بابا خاں کا تعارف کرایا۔ اس تعارف کے بعد غلام بابا اور غالب کے خط و کتابت بھی نہ ہونے پائی تھی کہ میر جعفر علی خاں رئیس سورت (خسر میر غلام بابا) کا ۳۱ر اگست ۱۸۶۳ء میں انتقال ہو گیا۔ نواب غلام بابا خاں کی جانب سے غالب کو جو پہلا خط ملا وہ جعفر علی خاں کی وفات سے متعلق تھا۔ غالب نے اس خط کا جواب اور قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے۔[۱۱]

---

[۴] ص۱۔ محققین کا خیال ہے کہ لطائف غیبی دراصل غالب کی تصنیف ہے جو سیاح کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ یقینی ہے کہ سیاح نے اپنی سیر و سیاحت کا احوال غالب کو سنایا ہوگا۔

[۵] اودھ اخبار کے ایک بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ دیکھئے تکملہ۔ اسی طرح غالب کے جولائی ۱۸۶۰ء کے خط سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے۔ اس خط میں سیاح کو برخوردار لکھا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۸۶۰ء سے پہلے ہی سے ان کے تعلقات گہرے اور بے تکلف تھے حوالہ مہری رام نے خمخانۂ جاوید اور مرزا محمد عسکری نے ادبی خطوط غالب میں استاد شاگرد کے تعلقات کو ۱۸۶۴ء بتایا ہے جو صحیح نہیں۔

[۶] ضمیمہ نمبر ۱ خط ۱۔ [۷] ضمیمہ نمبر ۱ خط ۲۔ [۸] ضمیمہ نمبر ۱ خط ۱۱۔ [۹] ضمیمہ نمبر ۱ خط ۸۔

[۱۰] غالب کے اس خط سے ظاہر ہے کہ سیاح نے غلام بابا خاں سے اپنی ملاقات کے بعد کوئی خط لکھا ہوگا جس کا یہ جواب ہے۔ واضح رہے کہ نواب میر جعفر علی خاں اس وقت زندہ تھے۔ ان کا انتقال ۳۱ر اگست ۱۸۶۳ء میں ہوا ہے۔ ان کے مصاحبین میں منشی لطف اللہ مرزا علی اکبر وغیرہ تھے۔ سیاح کا تعلق غلام بابا خاں سے تھا۔ نواب جعفر علی خاں کی سرکار سے نہیں تھا۔ سیاح نے بھی کسی جگہ نواب صاحب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ضمیمہ نمبر ۱ خط نمبر ۱۱۔

[۱۱] ضمیمہ ۱ خط ۱۔

غلام بابا خاں کے مصاحبین میں شامل ہونے کے بعد قریب آٹھ نو سال یعنی ۱۸۷۱ء تک سیاح کے صرف ایک سفر کا پتہ چلتا ہے[۱۲] اس سفر کی تفصیلات آگے بیان کی جائیں گی۔ ۱۸۶۵ء میں سیاح نے سورت کے ایک شریف خاندان کی عارفہ بی نامی لڑکی سے عقد کر لیا تھا۔ کئی اولادیں بھی ہوئیں لیکن کوئی بچہ زندہ نہ رہا۔ ایک بچے کے انتقال پر غالب نے اس طرح تعزیت کی ہے:-

"تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مرجانا معلوم ہوا ...... تم ابھی جوان ہو حق تعالیٰ
تمہیں صبر اور نعم البدل دے[۱۳] والسلام"

اولاد زندہ نہ رہنے پر سیاح نے آخر عمر میں محلہ سید واڑہ کے ایک شریف گھرانے کی بچی کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ اس کی شادی سوداگر واڑہ کے عبدالرشید نامی ایک شخص سے کر دی تھی[۱۴] اس طرح ایک لڑکے کو بھی پرورش و پرداخت میں بہت دلچسپی لی تھی لیکن یہ اوباش نکلا تو تنگ آکر گھر سے نکال دیا تھا۔

غالب کے ایک خط کے مضمون سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاح ۱۸۶۶ء کے نومبر یا دسمبر میں اپنے وطن اورنگ آباد اپنے عزیزوں سے ملنے کی غرض سے گئے تھے۔ غالب کے خط کا مضمون دیکھئے:-

"...... تم اندیشہ نہ کرو اور قصیدہ نذر گزرانو اور مع الخیر وطن کو جاؤ۔ لیکن بھائی وطن پہنچ کر ضرور
مجھ کو خط لکھنا اور اپنے گھر کا پتہ لکھنا تاکہ میں اس نشان سے تم کو خط بھیجوں ....[۱۵]

غالب کا دوسرا خط اس امر کی تصدیق کرتا ہے۔ خط کا مضمون یہ ہے:-

"صاحب میں خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ تم اپنے وطن گئے اور عزیزان وطن کو دیکھ کر خوش ہوئے
اور مع الخیر و عافیت اپنے محسن و مربی کی خدمت میں پھر آپہنچے ....[۱۶]

ان دونوں خطوں کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ جب سیاح کو سورت میں سکون نصیب ہوا اور ملازمت کی وجہ سے اعزاز ملا تو سرخروئی کے ساتھ چھ ڈیڑھ مہینے کے لئے اپنے وطن گئے۔ اس سفر کے بعد معلوم ہوتا ہے چار پانچ سال سیاح اپنے آقائے ولی نعمت کی حضور میں رہے۔ ۱۸۷۱ء میں پھر شوق ہی گیا اور اس جہاں گرد نے رخت سفر باندھا۔ منشی نولکشور سیاح کے پرانے دوستوں میں تھے۔[۱۷] منشی صاحب آغاز سال ۱۸۷۱ء میں میر غلام بابا خاں کے بچوں کی کسی تقریب میں بمقام سورت شریک ہوئے تھے[۱۸] اس وقت سیاح سے ان کا ماہ جولائی میں سیر کشمیر کے لئے جانا طے پایا تھا۔[۱۹] چنانچہ جولائی میں منشی صاحب نے سیاح کو کانپور طلب کیا۔ سیاح

---

[۱۲] ضمیمہ ۱ خط (۱۲)

[۱۳] اردوئے معلی ص ... خط ۲۵ اگست ۱۸۶۶ء

[۱۴] راقم نے انھیں دیکھا ہے۔ یہ سورت کی بنی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ انبیر ہی بحیثیت پوسٹ ماسٹر تھے۔ ریٹائر ہو کر سورت چلے آئے تھے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان انتقال کیا۔

[۱۵] اردوئے معلی ص ۲ خط مورخہ نومبر ۱۸۶۶ء۔ رام نرائن ایڈیشن میں اس خط کے نیچے نومبر ۱۸۶۲ء لکھا ہے جو غلط ہے۔

[۱۶] اردوئے معلی ص ۲۱۔ اس خط میں ۲۳ جنوری ۱۸۶۹ء ہے لیکن یہ تاریخ غلط ہے۔ لاہور ایڈیشن میں ۲۳ جنوری ۱۸۶۹ء ہے مگر یہ بھی غلط ہے۔ صحیح تاریخ جنوری ۱۸۶۷ء ہونی چاہئے کیونکہ نومبر ۱۸۶۶ء میں سیاح وطن گئے اور یہ قرین قیاس ہے کہ ڈیڑھ مہینہ [illegible] جنوری ۱۸۶۷ء میں لوٹ آئے۔ دیکھئے ضمیمہ ۱ خط [illegible]

[۱۷] "مسیر سیاح" [illegible] آغاز سال ۱۸۷۱ء میں [illegible]

وعدے کے مطابق ۱۲ اگست کو سورت سے روانہ ہوئے اور بمقام سچین[۲۰] نواب سیدی[۲۱] ابراہیم خاں محمد یاقوت خاں والی ریاست سچین سے نیاز حاصل کرتے ہوئے بمبئی گئے[۲۲]۔ بمبئی میں تین روز قیام کرکے پندرہ اگسٹ کو صبح کی گاڑی سے کانپور روانہ ہوگئے۔ ۱۸ اگست کو کانپور پہنچنے پر سیاح کو معلوم ہوا کہ منشی نولکشور ان کا انتظار کرنے کے بعد تنہا عازم سفر ہوگئے۔ اتفاق سے بارش اور سیلاب کی وجہ سے ریلوں کا نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ اس سبب سے منشی صاحب کو کشمیر کا سفر ملتوی کرنا پڑا۔ منشی صاحب گھر لوٹے تو سیاح سے ملاقات ہوگئی جو چند گھنٹے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ سیاح نے کانپور میں چار روز قیام کیا اور وہاں سے لکھنؤ پہنچے جہاں منشی صاحب کے مہمان رہے۔ سیاح کے اعزاز میں شب و روز محفل رقص و سرود منعقد ہوتی اور اہل ذوق نیز دیگر اکابرین کی صحبتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ لکھنؤ میں ایک بزم مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ سیاح نے مصرعہ طرح دیا "اس مہر نے زمین سے کیا آسماں مجھے"۔ ۲۱ رجب ۱۲۸۸ھ (مطابق ۱۸۷۱ء) بروز شنبہ دن کے چار بجے قدیم چوک میں مشاعرہ ہوا۔ سیاح اس کے صدر نشین تھے۔ لکھنؤ میں کچھ دن گذار کر یہ آگرہ گئے۔ آگرہ میں مجھو خاں اور صوفی صاحب نے بڑے تپاک سے ان کے اعزاز میں دعوت کی۔ آگرہ کی دعوتوں سے فارغ ہوکر سیاح دہلی پہنچے۔ دہلی میں بھی اہل ذوق نے بڑی گرمجوشی سے سیاح کا استقبال کیا۔ قربان علی سالک، بدرالدین خاں مترجم "بوستان خیال"، مرزا محمد حسن، حکیم محمود خاں، حکیم محمد رضا، سید محمد فخرالدین وغیرہ سے صحبتیں رہیں۔ اولیاء کرام کے آستانوں پہ حاضری دینے کے بعد اپنے استاد کی آخری آرام گاہ پر فاتحہ پڑھا اور عقیدت کے پھول چڑھائے۔ دہلی میں نواب ضیاء الدین نے بھی سیاح کے اعزاز میں دعوت کی۔ دہلی سے یہ ایک دن کے لئے میرٹھ بھی ہو آئے۔ چونکہ سیاح کو لکھنؤ سے بڑی دلبستگی تھی۔ لہٰذا دہلی سے پھر لکھنؤ پہنچے۔ لکھنؤ میں اس دفعہ کوئی رام پرشاد نے نہایت پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ اس موقعہ پر چند طوائفوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ ان میں ایک شیریں نامی طوائف بھی مدعو تھی۔ یہ شعر بھی کہتی تھی۔ سیاح نے سر مجلس شیریں کو چند قافیے دیئے۔ شیریں نے ان قافیوں کو موزوں کرکے اسی مجلس میں شعر سنا دیئے۔ شیریں کی ایک غزل "سیر سیاح" میں شامل ہے جو یہاں درج کی جاتی ہے۔

غزل شیریں

فصل گل آتی ہے لے دست جنوں دھیان رہے	ٹکڑے دامن ہو سلامت نہ گریبان رہے
دل پسا جاتا ہے قدموں کے تلے صاحب کے	پاؤں آہستہ سے رکھنے کا ذرا دھیان رہے
تیری صورت پہ نظر ہو ترے قدموں پہ ہو سر	تیری الفت میں مروں یہ میرا ایمان رہے
خانۂ چشم سے یہ کہہ کے سدھاری مری روح	اپنے گھر جاتے ہیں تھوڑے یہاں مہمان رہے
آرزو کوئی نہ بر آئی فلک کے ہاتھوں	دل بے تاب میں لاکھوں مرے ارمان رہے

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۹) مشہور و معروف روزگار نولکشور مالک مطبع اخبار اودھ کے بارہ برس سے یعنی سفر لندن سے میرے حال پر توجہ خاص فرماتے ہیں۔۔۔۔ وعدۂ سیر کشمیر کو جولائی میں قرار دے کر نہ دیدہ کو چشمک لگائی۔ راقم نے والد مرحوم کی زبانی سنا ہے کہ منشی صاحب کے اس قیام میں غلام بابا خاں نے سورت کے ایک اَن پڑھ شاعر بنو میاں کو منشی صاحب سے ملایا تھا۔ بنو میاں اڑبھنگ تخلص کرتے تھے (گجراتی اردو میں اڑبھنگ اوٹ پٹانگ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے) منشی صاحب نے بنو میاں سے کلام سنا اور نہایت سلجھا ہوا پایا تو انھیں ذکا تخلص کرنے کا مشورہ دیا۔ بنو میاں نے اسی روز سے ذکا تخلص اختیار کرلیا۔ ہم نے اپنی کتاب "سخنوران گجرات" میں بنو میاں کے حالات اور کلام کا نمونہ دیا ہے۔

[۲۰] سورت سے نو میل کے فاصلے پر ایک ریاست ہے۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے ضمیمہ ۲

[۲۱] دیکھئے ضمیمہ ۲

[۲۲] اس سفر کے حالات سیر سیاح میں موجود ہیں۔

لکھنؤ میں کوئی دو ماہ کے قیام کے بعد سیاح نے بہ قصد سورت کانپور کا رخ کیا۔ منشی نولکشور بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اب کی بار کانپور میں سیاح کی آمد پر ایک مجلس مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا لیکن ماہ صیام اور سیاح کی علالت کی وجہ سے یہ مشاعرہ منعقد نہ ہو سکا۔ اگرچہ مشاعرہ نہ ہو پایا لیکن شعراء نے غزلیں لکھی تھیں وہ سیاح نے جمع کر لیں۔ اس مشاعرہ کی غزلیں سیر سیاح میں درج ہیں۔ کانپور سے سیاح الہ آباد گئے۔ اس جگہ کوئی میر ظہور حسین صاحب نے انھیں دو دن کے لئے ٹھہرا لیا۔ تیسرے دن یہ بمبئی کے لئے ریل پر سوار ہوئے اور بمبئی ہوتے ہوتے سورت پہنچ گئے۔

اس دفعہ سورت میں دو ایک سال گذارے اور پھر سیاحت کی ٹھانی۔ ۱۸۷۳ء میں سیاح نے میر جعفر علی کے چھوٹے بھائی میر باؤ علی خاں کے ہمراہ بمبئی اور پونا کا ایک چھوٹا سا سفر کیا[۲۳] لیکن ۱۸۷۵ء میں ان کا کاروانِ حیات دکن میں سرگرم سفر پایا جاتا ہے۔ ۱۸۷۵ء کے اواخر میں مدراس جانے کی نیت سے بمبئی گئے۔ بمبئی میں نواب سیدی عبد الغنی سے نیاز حاصل کرنے کے بعد ۳ر جنوری کو پونا گئے۔ پونا سے پنچ گنی اور کڑپا کی سیر کرتے ہوئے مدراس پہنچ گئے۔ مدراس میں سیاح کی بڑی آؤ بھگت ہوئی مگر فساد کی وجہ سے جھگڑے جھمیلے بھی رہے اور نوبت اخباروں تک پہنچی۔ فتنے کے اٹھنے کی بڑی وجہ مدراس کے گورنر کی اہلیہ سے ملاقات تھی۔ حاسدوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ مدراس پہنچنے کے بعد لیڈی ہوبرٹ (اہلیہ گورنر مدراس) سے ملاقات کی تقریب نکل آئی۔ لیڈی ہوبرٹ بڑی تکریم سے پیش آئیں۔ اس نے تاڑ لیا کہ یہ شاعر ضرور ہوں گے۔ اس نے سیاح سے کچھ کلام سنانے کی فہمائش کی۔ سیاح نے اس وقت آئندہ کے وعدہ پر ٹال دیا۔ مدراس میں بھی اہل ذوق نے سیاح کا بڑا پرتپاک استقبال کیا۔ مجلس رقص و سرود اور اہل علم کی صحبتوں میں رات دن گذرتے رہے۔ مدراس سے موقع نکال کر بنگلور، میسور، سرنگاپٹن بھی گئے اور واپس مدراس آ گئے۔ اسی دفعہ گورنر مدراس کی شان میں مدحیہ قصیدہ کہہ کر گذرانا۔ قصیدہ لیڈی ہوبرٹ نے بہت پسند کیا اور انھیں بہت عزت بخشی۔ اس قصیدے کے انعام میں ایک طلائی لاکٹ بھی عنایت ہوا تھا۔ ۱۸۷۶ء کے مارچ کے مہینے میں مدراس سے حیدرآباد آ گئے۔ حیدرآباد میں بھی اکابرین نے ان کا استقبال کیا۔ یہاں سالار جنگ، وقار الامراء اور شمس الامراء سے بھی ملاقات کا موقع مل گیا۔ سیاح ۲۰ کو سفر دکن سے بمبئی لوٹ گئے۔ بمبئی میں اتفاق سے منشی نولکشور موجود تھے۔ منشی صاحب نے سیاح کو مہاراجہ جے پور سے ملایا۔ یہاں کی صحبتوں سے فارغ ہو کر ۱۳ر مارچ کو سورت پہنچ گئے۔

سیاح نے سورت آ کر ابھی دم لیا تھا کہ شہزادہ ایڈورڈ (ایڈورڈ ہفتم) کے ورود ہند اور مختلف مقامات پر اس کے استقبال کی دھوم دھام دیکھنے کے شوق نے انھیں بے تاب کر دیا۔ یہ سورت سے بمبئی اور بمبئی سے ۴ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو الہ آباد پہنچے۔ وہاں سے عظیم آباد ہوتے ہوئے کلکتہ گئے۔ کلکتہ میں ان کے کچھ شناسا موجود تھے۔ کلکتہ میں سیاح ایک تاجر طباطبائی کے مہمان رہے۔ یہاں مہاراجہ پٹیالہ اور کوئی مولوی عبد اللطیف خاں سے ملاقات کے بعد مہاراجہ جے پور اور مہاراجہ کشمیر سے بھی نیاز حاصل کیا۔ اسی موقع پر سالار جنگ سے بھی ملاقات ہونے والی تھی لیکن پتہ نہ چلا کہ ملاقات وقوع میں آئی یا نہیں[۲۴]۔

---

۲۳ دیکھئے ٹنگمیلہ۔ پنچ گنی بمبئی سے ۰ ۸ میل کے فاصلے پر ہوا خوری کا ایک بلند مقام ہے۔ یہاں دق کے مریضوں کے لئے اسپتال اور مکانات کا انتظام ہے۔ گرمی کے موسم میں اہل بمبئی اکثر دو چار ماہ کیلئے جاتے ہیں۔ ٹنگمیلہ میں اس سفر کی تفصیلات ہیں لہٰذا ہم نے یہاں اعادہ مناسب نہیں سمجھا۔

۲۴ کشف الاخبار بمبئی جلد ۲۱، ۲۹ر دسمبر ۱۸۷۶ء۔

کلکتہ سے یہ پٹنہ ، بنارس ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور تین چار روز قیام کے بعد ۱۲ جنوری کو مراد آباد اور رامپور گئے۔ قرین قیاس ہے کہ یہ دہلی بھی گئے ہوں گے۔ [۲۵] ۲۳ فروری کو پھر یہ لکھنؤ میں پائے جاتے ہیں۔ [۲۶]
شہر شہر، شہزادے کے خیر مقدم اور استقبال کے جشنوں کی رونق دیکھ کر نہ جانے سیاح کب سورت لوٹے مگر ۱۸۷۸ء میں پھر یہ شہاب ثاقب بمبئی میں پایا جاتا ہے۔ ان کے لئے یہ سال منحوس تھا۔ ان کے اوج اقبال کی حد آ چکی تھی۔ پاؤں کے چکر نے بدبختی کے چکر میں ڈال دیا۔ قصد سفر کہیں کا تھا اور قسمت کہیں اور لے گئی۔ سیاح کو قلب سازی سے دلچسپی تھی۔ تعجب کی بات نہیں کہ عہد جوانی ہی سے اس فن میں انھیں مشق حاصل ہو کیونکہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سیاحی میں گذرا۔ غلام بابا خاں کی سرکار سے بھی انھیں صرف پندرہ ۱۵ روپے ماہانہ ملتے تھے جو رقم چھوٹے سے سفر کے لئے بھی کافی نہیں اور سیاحی بغیر زر و مال روسیاہی ہوتی ہے۔ غرض یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عرصۂ دراز تک سیاح نوٹ بناتے رہے اور راز کھلنے نہ پایا۔ سال مذکور میں سیاح نے حیدر آباد جانے کے لئے وکٹوریہ ٹرمینس (بوری بندر اسٹیشن) پر دوسرے درجے کا ٹکٹ خریدنے کے لئے سو ۱۰۰ روپے کا نوٹ بھنایا۔ بدقسمتی دیکھئے کہ ان کے جاتے کے بعد فوراً ہی دوسرا مسافر بھی سو ۱۰۰ روپے کا نوٹ لے کر کسی جگہ کا ٹکٹ خریدنے آیا۔ جیسے ہی ایک نمبر کے دو ۲ نوٹ یکجا ہو گئے تفتیش شروع ہوئی۔ سیاح اس وقت تک جا چکے تھے۔ پولیس نے حیدر آباد اطلاع کر دی۔ سیاح کو حیدر آباد کے اسٹیشن پر حراست میں لیا گیا اور یہ بمبئی لائے گئے۔ بمبئی میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور اقبال جرم کے بعد انھیں ۱۸۷۸ء کے آس پاس (۱۴) سال کی سزائے قید ہو گئی۔ [۲۷]
خوش قسمتی سے جیل خانے کا افسر (جیلر) ایک زرتشتی تھا۔ اس نے سیاح کے علم و فضل کی قدر کرتے ہوئے انھیں اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ اسی وجہ سے سیاح کو قید خانے میں ہر قسم کی رعایتیں حاصل ہو گئیں اور قید کی صعوبتوں سے بچ گئے۔ دوران قید میں ملکۂ وکٹوریہ کی سلور جوبلی کا موقع ۱۸۸۷ء میں آ گیا۔ سیاح نے اس تقریب پر ایک مدحیہ قصیدہ لکھا۔ جیلر نے یہ قصیدہ اپنی پر زور سفارش کے ساتھ حکومت ہند کے توسط سے ملکہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس قصیدے کے صلے میں سیاح کے زمانۂ حبس میں کئی سال کی تخفیف کر دی گئی۔ [۲۸]
الغرض جہاں سیاح کے فن قلب سازی نے انھیں عالم عالم کی سیر کرائی اور آخر میں ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بھی لگا دیا وہاں ان کے فن شاعری نے انھیں روحانی کوفت سے بھی نجات دلائی۔ رہائی کے بعد سیاح نے سورت میں بہر صورت اپنی زندگی کے دن گذارے اور کہیں باہر جانے کا نام نہ لیا۔ سیاح پر آخری چند سال بڑے کٹھن گذرے۔ نہ آمدنی کا کچھ ذریعہ تھا نہ اچھے دنوں میں کچھ پس انداز کیا تھا۔ مالی مشکلات نے انھیں اتنا تنگ کر دیا تھا کہ اہل دول کے سامنے دست سوال بڑھانے تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ سیاح نے قصبۂ راندیر

---

[۲۵] تکملہ (اودھ اخبار)۔
[۲۶] کشف الاخبار اور اودھ اخبار (تکملہ)۔
[۲۷] و [۲۸] بہ روایت سید حمید الدین سورتی چبدار۔

کے سیٹھ اعظم بھام اور دوسرے حضرات سے مالی امداد کے لئے تحریراً استدعا کی تھی۔[۲۹] یہ پتہ نہ چلا کہ ان لوگوں نے کس حد تک سیاح کی دستگیری کی لیکن سیاح کے ایک مداح و خیر خواہ حکیم شیخ محمود میاں ان کے کفیل ہوئے تھے اور محلہ رانی تلاؤ میں اپنے مکان کے برابر دوسرے مکان میں سیاح کی رہائش کا انتظام کر دیا تھا[۳۰] اور حتی المقدور سیاح کی خدمت کرتے رہے۔ حکیم صاحب کی دستگیری کی وجہ سے سیاح کی کلفتوں کی ایک گونہ تلافی ضرور ہو گئی۔ زندگی کے باقی دن برے بھلے طریقے پر گذار کر پچاسی سال کی عمر میں ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء میں اس سیاح جہاں نورد نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ بڑے خان کے چکلے میں خواجہ سید جمال الدین نقشبندی قدس سرہٗ (خواجہ دیوانہ صاحب) کے قبرستان میں ان کی آخری آرامگاہ ہے[۳۱]۔ سیاح کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ عارض بی کو نواب غلام بابا خاں کے صاحبزادے میر مظفر حسین خاں نے اپنے محل میں بلا لیا تھا۔ نواب صاحب موصوف ان کو بہو کے نام سے پکارتے تھے۔ عارض بی نے ۸۰ سال کی عمر میں ۱۳۳۸ھ ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔ میر مظفر حسین کے پوتے میر غلام غوث (حال مقیم بمبئی) کا بیان ہے کہ انھوں نے انہیں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ یہ بہت حسین تھیں اور بڑھاپے میں بھی ان کے حسن و جمال کو زوال نہیں آیا تھا۔

سیاح سرخ و سفید اور وجیہہ شخص تھے۔ قد، بدن، چہرے وغیرہ کا انداز ان کی تصویر سے ہو جاتا ہے۔ بزرگوں سے سنا گیا ہے کہ ضعیفی میں بھی چہرے سے نور ٹپکتا تھا اور تمکنت و وقار آشکارہ تھے۔ دورانِ گفتگو میں ہر لفظ اور ہر فقرہ اس قدر نرم لہجہ میں آہستہ آہستہ ادا کرتے کہ گویا منہ سے پھول جھڑتے۔ بحث میں غصہ کو قریب نہ آنے دیتے۔ اس زمانے میں سورت شاعروں سے بھرا ہوا تھا۔ ایسے مقامات پر ادبی رقابت ناگزیر ہوتی ہے لیکن سیاح کسی سے کبھی نہ الجھتے۔ صرف ایک مثال ایسی ملتی ہے جب کہ سورت کے ایک شاعر شیخ لعل شانہ گر متخلص یکتا کی غزل پر غزل کہی۔ اس غزل کا مقطع ہے ؎

بہت غیروں کو ہم سیاح ہٹر اروز پاتے تھے لیا جب آڑے ہاتھوں ہم نے سارا بانکپن بھولے

یہ غزل مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔ یکتا کا پیشہ شانہ گری تھا۔ سید علوی العیدروس علوی شاگرد محمد منظور منظور کا شاگرد تھا۔ اگرچہ ان پڑھ تھا لیکن شاعری کے لئے طبیعت موزوں پائی تھی۔ اس کی غزل اس موقع پر لطف سے خالی نہیں لہٰذا درج کی جاتی ہے ؎

تصور تھا سراپا حور کا پر جان من بھولے لکھا تجھ کو پری رو ہم نے اے رشک چمن بھولے
سراپا عالم تنہائی میں شہر و وطن بھولے ترے وحشی بھٹکتے پھرتے ہیں صحرا و بن بھولے
خیال سایۂ بالِ ہما آنکھوں میں کھٹکے ہے کمر کی جستجو میں سو میاں یاد دہن بھولے
نبات آسا عزیز و یوسف مصری کی چاہت ہے جھنکاتی ہے زلیخا کو کنویں چاہ ذقن بھولے

---

۲۹ راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔
۳۰ حکیم محمد قاسم صاحب کا بیان ہے۔ مکان مذکور اب تک حکیم صاحب کی ملکیت ہے۔
۳۱ مرزا عسکری نے سیاح کا انتقال بمقام بمبئی لکھا ہے جو صحیح نہیں۔

خطا میں مہکے ہیں کس کے عنبریں گیسو — جو بوئے نافۂ مشکیں غزالان ختن بھولے
جو چاہوں نالۂ جانکاہ سے گردوں کو چکراؤں — ابھی گردش میں لاناتو جوانوں کا کہن بھولے
غنی ہو کر فقیروں سے کرے ہیں عشق کا سودا — ہماری نقد دل لے کے پونجی سیم تن بھولے
خدا حافظ ہے یکتا اب ہمارے دین و ایماں کا — بتوں کے عشق میں عقبیٰ کا سب عیش دمی بھولے [۳۱]

سیاح کی وضع داری اور نفاست شہر میں ضرب المثل تھی۔ خوش پوشی اور خوشبو کا شوق آخر عمر تک نہ گیا۔ پانچ ہاتھ کا صافہ، ململ کا پیرہن، چھوٹی مہری کا پاجامہ، انگرکھا اور اس پر چوغہ ان کا لباس تھا۔ وضع داری کے اس قدر سختی سے پابند تھے کہ کسی کو بھی اگر خلاف وضع کپڑے پہنتے دیکھ پاتے تو اچھے انداز میں سمجھا دیتے۔ لباس کے بارے میں ذوق و نفاست کا یہ عالم تھا کہ کپڑے دہلی میں سلواتے تھے۔ راقم کے والد نے ایک دفعہ سیاح سے گذارش کی کہ قبلہ سورت میں بھی اچھے درزی موجود ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ کپڑے دہلی میں سلوائے جاتے ہیں۔ سیاح نے والد کا دل رکھنے کے لئے ایک پیرہن کا ٹکڑا اور ناپ کا پیرہن دیا اور کہا کہ یہ سلوالاؤ۔ دیکھیں یہاں کیسے سیتے ہیں۔ چند روز بعد جب سلا ہوا پیرہن حاضر کیا گیا تو اسے غور سے دیکھنے کے بعد کہا میاں! ہمارا کپڑا ابھی خراب ہوا۔ درزی نے کلی کے ٹانکے چھوٹے بڑے کردیئے۔ والد کے پاس اس باریک بینی کا کوئی جواب نہیں تھا۔[۳۲] اگرچہ آخری عمر میں تقدیر میں شکن پڑ چکا تھا لیکن کپڑوں پر کبھی شکن گوارا نہ کیا۔ اگر آدھ گھنٹے کے لئے مکان سے کہیں باہر جاتے تو گھر لوٹنے کے بعد آدھ گھنٹہ کپڑوں کے شکن استری سے نکالتے۔ ان مفلسی کے ایام میں بھی ایک مرتبہ پہنے ہوئے . . . . لباس کا دوبارہ پہننے کا موقع مہینوں میں کبھی آتا۔ عطریات کا شوق بھی تھا اور نہایت نفیس ذوق بھی پایا تھا۔ کبھی خلاف موسم کوئی عطر استعمال نہ کرتے۔ اسی طرح صافے کا رنگ بھی موسم اور آسمان کے رنگ کی مطابقت میں ہوتا۔ جس محلے سے ان کا گزر ہو جاتا تو وہاں کے لوگ بغیر دیکھے کہہ دیتے کہ منشی صاحب راستے سے گذر رہے ہیں۔ راقم کے والد اگرچہ عہد شباب میں شہر کے وضع دار کج کلاہوں میں شمار کئے جاتے تھے تاہم سیاح کو اس بارے میں استاد مانتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے وضع داری کی باریکیاں انھیں سے سیکھی تھیں۔ مکان کی بیٹھک میں سفید چاندنی بچھی رہتی اور دیوار سے گاؤ تکئے ہوتے۔ سیاح کا معمول تھا کہ روزانہ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر قلمدان لے کر بیچ میں بیٹھ جاتے اور دو تین گھنٹے خطوط اور دوسری ایسی چیزیں لکھتے رہتے۔ خط وغیرہ لکھتے وقت کبھی کاغذ کو کسی چیز پر نہ رکھتے۔ کاغذ کو ایک ہاتھ سے سامنے پکڑ لیتے اور دوسرے ہاتھ سے لکھتے جاتے۔ دو تین گھنٹوں میں چار پانچ قلم بدلتے جو ترشے ہوئے تیار رکھ لیتے۔ حکیم محمد قاسم صاحب کا بیان ہے کہ اکثر صبح یہ کھیلتے ہوئے سیاح کی بیٹھک میں چلے جاتے۔ سیاح انھیں دیکھتے ہی کہتے بیٹا! چاندنی پر نہ آنا۔ اس کے بعد اپنی اہلیہ کو آواز دیتے وہ آتیں اور محمد قاسم صاحب کے پاؤں دھلاتیں اور کپڑے سے پونچھتیں۔ تب کہیں انھیں چاندنی پر قدم رکھنے کی اجازت ملتی۔ آخری چند سالوں میں جلسوں اور تقریبوں میں بہت کم شریک ہوتے۔ لیکن روزانہ کا یہ معمول تھا کہ شام کو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گھر کے قریب بازار لیمڑی چوک میں ایک تاجر کتب سراج الدین کی دوکان پر جا بیٹھتے۔ اسی دوکان پر دوسرے بھی اہل ذوق کی نشست تھی۔

---

[۳۲] تاریخ گجرات (مخطوطہ) مرتبہ سید عبدالرحمن عیدروس۔

[۳۳] یہ اتفاق ہے ورنہ آج بھی سورت میں کپڑوں کی سلائی میں نفاست پائی جاتی ہے۔ یہاں عورتیں ۴۲ ، ۴۴ کلی کا کرتہ پہنتی ہیں۔ پشواز کا بھی بہت رواج تھا۔

تصنیفات

مرتبہ مجموعہ غزلیات سیاح کے بڑھاپے کی کمائی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ بعض شہادتوں سے واضح ہوتا ہے۔ سیاح کا ایک دیوان کسی میر صاحب کی بکری چھاپا گیا ۳۲ اس میں ان کے ابتدائی دور کا کلام ہوگا۔ سیاح کا ایک دیوان سنہ ۱۹۳۵ء یا سنہ ۱۹۳۶ء میں راقم کی نظر سے گذرا ہے۔ یہ نہایت خوش خط لکھا ہوا تھا اور بعض جگہ غالب کی اصلاحوں کی طرف اشارے بھی تھے۔ یہ دیوان مرتبہ مجموعے سے ضخامت میں سہ چند تھا۔ میرے لئے اس وقت یہ بتانا مشکل ہے کہ اس دیوان میں مرتبہ مجموعے کی غزلیں شامل تھیں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسی میں سے یہ انتخاب اشاعت کی غرض سے الگ کیا ہو۔ مذکورہ دیوان سیاح کے داماد عبدالرشید کی تحویل میں تھا۔ عبدالرشید کے انتقال کے بعد نہ جانے اس کا کیا حشر ہوا۔ باوجود تلاش کے وہ نایاب ہے۔ مرتبہ مجموعہ میں (۸۰) غزلیں اور (۳) سہرے ہیں۔ اس کے آخری صفحے پر خوشنویس نے اپنا نام امیرالدین لکھا ہے۔ اس مجموعے کی تفصیلات پہلے ہم دے چکے ہیں۔

سیاح کی ایک تصنیف "شہر آشوب" ہے۔ شہر آشوب کا موضوع کسبیوں سے متعلق ہے۔ اس مثنوی میں کسبیوں کے ہتھکنڈوں اور رئیس زادوں کا ان کے پھندوں میں پھنسنے کا حال بیان کیا گیا ہے اور دونوں فریق کو لعنت ملامت کی گئی ہے۔ مثنوی میں ایک جگہ لکھا ہوا ہے کہ یہ مثنوی عبرت دلانے کے خیال سے لکھی گئی ہے۔ مثنوی بانوے صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحے پر (۱۹) شعر ہیں۔ اس امر کی کوئی اندرونی شہادت نہیں ملتی کہ یہ سیاح کی تصنیف ہے۔ مثنوی کا مخطوطہ حکیم محمد قاسم صاحب کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور انھیں کا بیان ہے کہ یہ سیاح کی تصنیف ہے۔ یہ یقینی ہے کہ سیاح کی وفات کے بعد جو کتب، مخطوطے اور کاغذات حکیم صاحب کے ہاتھ آئے ان میں یہ بھی آئی ہے۔ مثنوی کا سنہ تصنیف ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء اور سنہ طباعت ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء ہے۔ شہر آشوب اس کا تاریخی نام ہے۔ اس کی تاریخ تصنیف و اشاعت کے متعلق ذیل کے اشعار دیکھئے:۔

نظم شد مثنوی شہر آشوب	بہر قوم شریر سرکوبی ست
بعد اتمام سال تاریخش	گفت ناظم چہ شہر آشوب ست
جب چھپی مثنوی شہر آشوب ہے	فرقہ بد کی بس میں خوازی ہے
سال ناظم نے جو لکھا مطبوع	خانگی رنڈی کسب ناری ہے

مثنوی کی تاریخ ناظم نے کہی ہے۔ اس زمانے میں بمبئی میں ایک حضرت ناظم حسین رضوی متخلص ناظم کاتب گذرے

---

۳۲ اودھ اخبار (تکملہ)

ہیں۔ قرین قیاس ہے انھیں ناظم نے مثنوی کی تاریخ کہی ہو کیونکہ کتاب حقیقت السورت تصنیف شیخ احمد و مرتبہ معلم عبد المنعم باعلظہ کا بھی قطعۂ تاریخ طباعت ناظم حسین ناظم نے کہا ہے۔ حقیقت السورت کا سنہ طباعت ۱۹۱۵ء ہے۔ شہر آشوب کا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ مثنوی شہر آشوب کے آخر میں عذر سخنوری کرتے ہوئے سودا سے برابری کا دعویٰ کیا گیا ہے:۔

مسودہ تک نہیں لکھا اس کا	نظر ثانی بھی نہ کی اصلا
غلطی مقتضائے انساں ہے	آب و گل میں بشر کے نسیاں ہے
ڈھنگ ہیں شاعری کے سب معلوم	میری ملک سخن میں ہے خوب دھوم
ہے تصرف زمین شعر پہ آج	ناظموں سے لیا ہے میں نے خراج
بارہا کیا ہے قافیہ تنگ	جن کو کچھ شاعری کی آئی امنگ
منہ کی کھائی مقابل آیا جو	کم نہ سودا سے مجھ کو تم سمجھو
یہ نہ سمجھو کہ خودستائی ہے	بات سچی زباں پہ آئی ہے
منصفوں کا ہوں خاک پا واللہ	شعرا سے ہے میری رسم و راہ

سیاح کی ایک تصنیف "سیر سیاح" ہے۔ یہ شمالی ہند کے ایک سفر کے حالات سے متعلق ہے۔ ۷۲-۱۸۷۱ء میں سیاح نے لکھنؤ، دہلی، آگرہ، میرٹھ وغیرہ کا دورہ کیا تھا۔ اس سفر میں لکھنؤ اور کانپور میں مشاعرے بھی منعقد ہوئے تھے۔ یہ تصنیف سفر کے تفصیلی حالات اور مشاعروں کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ اسے منشی انوار حسین تسلیم اور نواب احمد حسین جوہر علی نے ترتیب دیا اور ۱۸۷۲ء میں مطبع نولکشور نے اسے شائع کیا۔ سیاح کے حالات زندگی میں ہم نے اس سے اقتباسات پیش کئے ہیں جن سے سیاح کے طرز تحریر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس سے ان کی علمی لیاقت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

برہان قاطع ایک طرفدار منشی سعادت علی کی تصنیف محرق قاطع برہان کے جواب میں سیاح نے ایک رسالہ موسوم بہ لطائف غیبی لکھا تھا۔ یہ رسالہ اکمل المطابع دہلی سے ۱۸۶۴ء (۹ ربیع الثانی ۱۲۸۱ھ) میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بیس اعتراضات کے جواب ہیں۔

مولانا حالی اپنی تصنیف یادگار غالب میں لطائف غیبی کو غالب کی طرف منسوب کرتے ہیں ۳۵ اسی طرح علیگڑھ میگزین غالب نمبر بابت ۔۔۔۔ء میں لطائف غیبی پر مولانا عبد المجید صاحب سالک کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں اسے غالب کی تصنیف ثابت کیا ہے۔

"یہ مسئلہ مختلف فیہ بنا ہوا ہے۔ لالہ سری رام نے خم خانۂ جاوید میں صرف اتنا لکھا ہے کہ آخر الذکر کتاب (لطائف غیبی) کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ میرزا کے قلم سے نکلی ہے مگر ان کے نام سے شائع کر دی گئی۔ ۳۶

محمد عسکری ادبی خطوط غالب میں مولانا محمد حسین آزاد کے بیان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

۳۵ دیکھئے کتابیات

"..... مگر ایسا نہیں ہے۔ مرزا جابجا ان کی لیاقت کی تعریف کرتے ہیں اور کہیں ان کو منع کرتے ہیں کہ اب کچھ ایسا نہ لکھنا۔" [۳۶]

اس کتاب کے تکملہ میں اودھ اخبار سے سیاح کی دو عبارتوں کے طرز نگارش کے متعلق جناب قاضی عبدالودود صاحب نے صرف اتنا لکھا ہے کہ

"عبارات ذیل لطائف غیبی کی بعض عبارات سے مشابہ ہیں۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

"یہ عبارتیں بھی لطائف غیبی کی یاد دلاتی ہیں۔"

قاضی صاحب کا فرمانا درست ہے۔ لطائف غیبی سے یہاں دو ایک عبارتیں پیش کی جاتی ہیں جن کو دیکھنے سے اندازہ ہو جائے گا۔ [۳۷]

(۱) "کیا منشی جی نے یہ قیاس کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں کوئی عالم، کوئی عاقل، کوئی مصنف نہیں ہے۔ اللہ اللہ ہندوستان مجمع فضل وکمال ہے۔ منشی جی کی حمق کا پردہ کھل جائے گا۔ بلکہ مولانا غالب کا ایک ایک شاگرد منشی جی کا خاکہ اڑا دے گا۔ مجکو تو حمیت اور رعایت حق اس تحریر کی باعث ہوئی تاکہ میں نے یہیں لطائف جمع کئے اور اس نگارش کا لطائف غیبی نام رکھا۔"

(۲) "مانا کہ قاطع برہان کے جواب لکھنے سے منشی جی کی مراد یہ تھی کہ کنج خمول سے باہر آئیں اور ایک صاحب نام ونشان کے مقابل ہو کر خود بھی نام پائیں یہ سمجھے کہ مشہور نہ ہوں گے مگر اشتہاری ہو جائیں گے۔ عزت نہ ملے گی مورد صد گونہ خواری ہو جائیں گے۔"

جب ہم سیر سیاح کی سیر کرتے ہیں تو اس کے بھی انداز بیان کو دیکھنے کے بعد حقیقت حالی کی رائے سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید میں خود غالب کا ایک بیان پیش کیا جا سکتا ہے۔ غالب اپنے ایک خط [۳۸] میں برہان قاطع کے ایک طرفدار رحیم بیگ اور اس کی تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ــــ

"اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو لطائف غیبی میں رد کر چکے ہو۔ بہرحال اب اس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔"

قیاس چاہتا ہے کہ سیاح نے منشی سعادت علی کے اعتراضات دیکھ کر ضرور کچھ لکھا ہوگا اور مشورہ و اصلاح کے خیال سے غالب کی خدمت میں بھیجا ہوگا۔ غالب نے اس پر قلم چلایا ہوگا بلکہ کئی اضافے بھی کر دیئے ہوں گے اور رسالہ و سیف الحق کا لقب بھی سیاح کے نام پر بڑھا کر اشاعت کی غرض سے فوراً ہی مطبع کو بھیج دیا ہوگا۔ سیاح کو اس وقت پتہ چلا ہوگا جب اس کے نسخے غالب نے انہیں بھجوائے۔ اس طرح لطائف غیبی کو غالب کی تصنیف ضرور کہہ سکتے ہیں

---

۳۶ دیکھئے کتابیات

۳۷ عبارات نمبر (۱) اور (۲) لطائف غیبی صـ۳ اور صـ۴

۳۸ ضمیمہ ۱ خط (۹)

لیکن دراصل یہ چیز سیاح کی ہی سمجھی جانی چاہیئے۔ غالب کے دو ایک خط بھی اس مغالطہ کا سبب معلوم ہوتے ہیں کہ یہ غالب کے قلم سے نکلی ہے۔ ایک خط تو وہ ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ـــــ

"جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے۔ اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو، تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ چلتی رہے گی۔"

لیکن اس کے بعد کے بھی دو ایک جملے غور طلب ہیں ـــــ

"لطائف غیبی نے اعدا کی دھجیاں اڑا دیں"

"تمہارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھا گیا ہے۔" [۱]

[۲] دوسرا خط وہ ہے جس میں غالب نے تصحیح کر کے لطائف کا ایک نسخہ سیاح کو بھیجا اور ہدایت کر دی کہ دوسرے رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو۔

---

[۱] ضمیمہ ۱ خط (۱۳)
[۲] ضمیمہ ۱ خط (۸)

تنقید

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ سیاح کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ہمارے پاس کوئی شہادت موجود نہیں۔ ان کے خاندان نے روز بد دیکھا اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں انھوں نے ترک وطن کی ٹھانی۔ اس عمر میں بظاہر فکر معاش کے سوا گھر چھوڑنے کا اور دوسرا سبب معلوم نہیں ہوتا۔ اتنی عمر میں ایک طالب علم کتنا علم حاصل کر سکتا ہے۔ ہر اہل علم کو اس کا اندازہ ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ سورت کی علمی و ادبی مجلسوں نے ان کے دل میں اکتساب علم کا شوق و ولولہ پیدا بھی کیا تاہم سیاحی کے شوق کے پیش نظر تحصیل علم کی تکمیل کہاں تک ہو سکی ہو گی اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سیاح نے اپنے وطن اورنگ آباد میں تھوڑی بہت تعلیم ضرور حاصل کی ہو گی جس کو لطائف غیبی میں "تحصیل علوم رسمیہ" کہا گیا ہے۔ ہم اپنے اس قیاس کی تائید میں سیاح کے نام غالب کے دو ایک خط پیش کر سکتے ہیں[٣٧] ان میں سے ایک خط میں نقط غربال کے استفسار کے جواب میں غالب نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیاح کو عربی کا حرف واجبی علم تھا۔ بایں ہمہ یہ ماننا پڑیگا کہ سیاح اچھی علمی ادبی لیاقت کے مالک تھے جو باقاعدہ تحصیل علوم کا نتیجہ نہ ہو لیکن انھوں نے سیاحی، علمی صحبتوں اور مطالعۂ کتب سے اپنے آپ کو بڑی حد تک اس قابل بنا لیا تھا۔ اس زمانے کی صحبتوں میں قدم قدم پر ایک صاحب ذوق کو اپنی علمی لیاقت کا ثبوت دینا پڑتا تھا۔ سیاح جیسے صاحب ذوق اور دلدادۂ شعر و سخن جس نے ہزاروں صحبتوں کو صرف دور سے ہی نہیں دیکھا خود شریک بلکہ صدر نشین بھی رہے ہوں اس نے کیا کچھ حاصل نہ کیا ہو گا۔ ان کی نثر و نظم۔ ان کی لیاقت کے تحریری ثبوت ہمارے سامنے موجود ہیں۔ صحیح معنوں میں سیاح تلاش و تحقیق کے جویا بھی تھے۔ بعض اوقات اپنے استاد سے معنی و تلفظ کے بارے میں استفسار بھی کرتے رہتے[٣٨] اس بات میں شک نہیں کہ سیاح نے ابتدائی عمر میں فارسی پڑھی ہو گی اور خوب پڑھی ہو گی۔ پھر انھیں ایران کی سیاحت کا موقع بھی مل گیا۔ لہٰذا فارسی زبان میں یہ مہارت رکھتے تھے اور نہایت بے تکلفی سے گفتگو بھی کر لیتے تھے[٣٩] غالب کے شاگرد ہونے کی وجہ سے تو پورے ملک میں ان کی قدر و منزلت تھی لیکن ان کی علمی لیاقت کی وجہ سے بھی ان کی اس حد تک وقعت تھی کہ اخباروں میں سیاح کو کوئی شایان شان خطاب دینے کی (جو علم و ادب سے تعلق رکھتا ہو) تجویز پر بحثیں ہوئی ہیں[٤٠]

تلمذ :- سیاح غالب کے محبوب شاگردوں میں سے تھے۔ غالب اپنے خطوط میں انھیں برخوردار، نور چشم، عزیز جان سعادت،

---

[٣٧] دیکھئے ضمیمہ نمبر ۱ خط نمبر ۱۵-۱۴ [٣٨] ضمیمہ ۱ خط نمبر ۱۵-۱۴
[٣٩] ادبی خطوط غالب ص ۲۸۱ راقم کے والد نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ [٤٠] دیکھئے تکملہ

واقبال نشان اور مذاقاً مولانا سیاح لکھا کرتے تھے۔ چند شہادتوں کے پیش نظر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس یگانگی اور یکجہتی کا آغاز ۱۸۶۰ء سے قبل ہو چکا تھا اور ۱۸۶۰ء میں تو تعلقات گہرے ہو چکے تھے۔ کیونکہ جولائی ۱۸۶۰ء کے خط میں غالب نے انھیں برخوردار لکھا ہے۔[41] صاحب خم خانۂ جاوید اور مرزا عسکری[42] کا بیان ہے کہ سیاح پہلے عشاق تخلص کرتے تھے۔ غالب نے عشاق سے بدل کر سیاح کر دیا۔ سیاح نے پہلے ہی ملاقات میں اپنی سیاحتوں کا ذکر کیا ہوگا۔ لہٰذا غالب نے ان کے شوق سیاحت کے پیش نظر ان کا تخلص بدل دیا ہوگا۔ خم خانۂ جاوید اور ادبی خطوط غالب کے علاوہ سیاح کے پہلے تخلص کا کہیں حوالہ نہیں ملتا۔ نہ سیاح نے کسی جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ غرض استاد و شاگرد کے درمیان رشتۂ محبت غالب کے آخر دم تک قائم رہا۔ سیاح بھی غالب کو محض استاد ہی نہیں بلکہ اپنا مشفق و مہربان بزرگ سمجھتے تھے اور غالب کی مالی امداد سے حق شاگردی بھی ادا کرتے رہتے تھے۔ جہاں تک سیاح کے کلام کا تعلق ہے سیاح نے اپنے کلام میں دو جگہ تلمذ غالب پر فخر کیا ہے۔

(۱) ہے تلمذ اسد اللہ سے ہم کو سیاح — شاعروں میں ہو نہ کیوں فخر مدارا اپنا

(۲) ظل کرم ہے حضرت غالب کا بس مجھے — سر پر نہیں ہے سایۂ بال ہما نہ ہو

شاعر فطری جبلت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس پر تعلیم و تربیت اور زمانہ و ماحول کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ انہی اثرات کی وجہ سے شاعر کا ایک مزاج قائم ہو جاتا ہے۔ اس کو اس کے طرز اور رنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا کسی شاعر کی خصوصیات شعری کے مطالعہ سے پہلے اس کی تعلیم و تربیت اور ماحول و زمانہ کا علم شاعر کا کلام سمجھنے اور اس کے نفسیاتی تجزیے میں بہت معاون ہوتا ہے اس لئے سیاح کے بھی کلام کے مطالعے اور اس پر رائے قائم کرنے سے پہلے ان کے ماحول و زمانے کا ایک سرسری جائزہ مفید مطلب ثابت ہوگا۔

سیاح ایک جہاں گرد شخص تھے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ سیر و سفر میں گذرا ہے۔ انھوں نے زمانے کے سرد و گرم کو خوب دیکھا تھا۔ انھیں اپنی زندگی میں بیسیوں علمی ادبی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا تھا اور بزرگوں کی آنکھیں دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ ایک تو غالب کے شاگرد تھے اور پھر سیاح ٹھہرے۔ زندگی میں دو تین بار اجڑی دلی کی پر رونق صحبتیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اسی طرح لکھنؤ کی بدحالی کو دیکھ کر کہنے کو تو یہ کہتے ہیں :—

آئے تھے لکھنؤ میں بڑے اشتیاق سے — دیکھا نہ کچھ تو کیا ایک بار کوچ

مگر ان کے حالات سیر و سفر سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں لکھنؤ سے بڑی محبت تھی اور کئی بار انھوں نے اس کوچے کی خاک چھانی ہے۔ جب کبھی ادھر کی طرف گذر ہوتا تو ایک آدھ جھانکی ضرور مار آتے۔ منشی نولکشور مالک مطبع و اودھ اخبار اور رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب جیسے ان کے لکھنوی دوستوں میں تھے۔ اسی طرح وہاں ان کے مداح و شناسا بھی کثرت سے تھے۔ غرض لکھنؤ کا ادبی ذوق انھیں کشاں کشاں وہاں لے جاتا تھا۔ سیاح کو ان کے ذوق سخن نے طوائفوں کے کوٹھے بھی جھنکوائے۔ سیاح تو کیا ان جیسے بے زبان رنگین پتلیوں کے پھیر میں آتے ہاں بعض طوائفوں پر سیاح کا جادو ضرور چل گیا تھا۔ سنا گیا ہے کہ[43] سیاح کے مرنے کے بعد ان کے گھر سے تصویر بتاں تو نہیں لیکن حسینوں کے خطوط ضرور نکلے۔ سیاح کے کاغذات میں چند طوائفوں کے خطوط پائے گئے

---

[41] ضمیمہ ۱۔ خط ۶۔ خط مورخہ ۱۱ جون ۱۸۶۰ء

[42] خم خانہ جاوید۔ ادبی خطوط غالب۔ کتابیات۔

[43] بہ روایت حکیم محمد قاسم۔

جو دیکھنے والوں نے بتایا ہے کہ یہ ادب پارے تھے[44] سیاح کے زمانے میں یہ بات معیوب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ طوائفیں اس وقت کی مہذب سوسائٹی کا جزو لاینفک تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مہذب صحبتوں نے طوائفوں کو بھی مہذب بنا دیا تھا۔ مگر جب مہذب لوگوں نے ان سے ترک تعلق کیا تو کوٹھوں سے تہذیب بھی رخصت ہوگئی۔

یہ بیرونی ادبی فضا کا ذکر تھا جس میں سیاح اکثر پر تولتے رہتے تھے لیکن اپنے وطن سورت کا بھی علمی ادبی ماحول ان کو متاثر کرنے کو کچھ کم نہ تھا۔ گجرات میں سورت، بھروچ، بڑودہ اور احمد آباد مغلیہ تہذیب کے مرکز رہے ہیں۔ ان مقامات کے روسا اور اہل دول کی علمی سرپرستی کی وجہ سے اہل علم کا ان مقامات پر اجتماع رہتا تھا۔ اردو زبان و ادب کے تدریجی ارتقا میں گجرات کے علماء، ادباء و صوفیا وغیرہ ہر دور میں حتی المقدور ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔ اگرچہ ولی متوفی ۱۱۱۹ھ کے بعد سے اردو کا مرکز شمالی ہند میں منتقل ہوگیا تھا تاہم اس کے بعد بھی یہاں ذوق سخن کسی طرح کم نہ ہونے پایا تھا۔ سیاح کا ثانی وطن سورت تھا۔ لہٰذا انیسویں صدی عیسوی کے سورت کے علمی، ادبی ماحول اور چند مقتدر ہستیوں کا حال سنئے۔

شہر سورت ہندوستان کے قدیم اور اہم شہروں میں سے ایک ہے۔ چودھویں صدی کے نصف آخر یعنی محمد تغلق اور فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اس کا نام کتب تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ پندرھویں صدی کے آغاز میں سورت ایک اہم تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ سلاطین گجرات کے عہد میں خداوند خاں کی زیر نگرانی ۱۵۴۶ء میں یہاں قلعہ تعمیر کرایا گیا تھا[45] ۱۵۷۳ء میں فتح اکبر کے وقت سے سیاسی، تجارتی اور معاشرتی حیثیت سے اس کی وقعت اور بڑھ گئی تھی۔ پرتگیزوں کے بعد ۱۶۰۸ء میں انگریزوں کی آمد کے بعد سے یہ ایک اہم تجارتی مرکز قرار پایا تھا۔ عہد مغلیہ اور اس کے بعد بھی سورت ہر پہلو سے بڑی اہمیت کا مالک رہا ہے۔ عہد جہانگیری میں شاہی خاندان کے افراد کے اس جگہ بڑے بڑے محلے تھے[46] عہد شاہجہانی میں سورت جہاں آرا بیگم کی جاگیر تھا[47] سترھویں صدی میں شیوا جی کے سورت پر پیہم حملوں کے باوجود اس کی تجارت عروج پر تھی[48] غرض سورت قریب ڈھائی سو سال مغلوں کے زیر نگیں رہنے کی وجہ سے گجرات میں مغلیہ تہذیب کا ایک مرکز بن گیا تھا اور دوسری طرف عرب تجار اور مشائخ کی وجہ سے اس جگہ اسلامی کلچر بھی دوش بدوش اپنا وجود قائم رکھ سکا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد مغربی تہذیب بھی اسی مقام سے ہندوستان میں داخل ہوئی۔ سب سے پہلے اسی جگہ کے لوگ اس تہذیب سے متاثر ہوئے تاہم سورت میں آج تک مغل اور اسلامی تہذیبوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن انیسویں صدی میں تو سورت مغلیہ اور اسلامی تہذیب کا جگمگاتا ہوا چراغ تھا۔ اس زمانے میں علوم و فنون کا بھی یہ ایسا مرکز تھا کہ باہر سے آنے والے اس سے بہت متاثر ہوتے۔ سورت کے ایک بزرگ منشی لطف اللہ فریدی[49] ۱۸۲۱ء میں جب اپنے وطن سے سورت میں پہلی بار آئے تو یہاں جید عالموں کے اجتماع کو دیکھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ تین سال تحصیل علوم کر کے اپنے آپ کو علماء کی صحبتوں میں شرکت کے قابل بنا لیا۔ اس زمانے میں صرف ایک محلے (بڑے خاں کا چکلہ) میں باون علما کے گھر تھے۔ اس کے لیے مشہور ہے کہ اس محلہ سے علماء کی باون پالکیاں نکلا کرتی تھیں۔

یہ تو سیاح کی آمد سے (۲۵) سال پہلے کا واقعہ ہے۔ لیکن سیاح کے زمانے میں بھی مشائخین، واعظین، مفتیان دین متین،

---

[44] یہ خطوط تلف ہوگئے۔ [45] بمبئی گزیٹر (قدیم) حصہ سورت ص ۲۸۵ [46] کمرشیل پالسی آف دی مغلز از ڈاکٹر ڈی. پنتھ

[47] راقم کے خاندان میں سورت سے متعلق ایک اکبر کا اور دوسرا جہاں آرا بیگم کا فرمان محفوظ ہے۔ جہاں آرا بیگم کے فرمان پر شاہجہاں کی بھی مہر ہے۔ اس کی تاریخ ۲۱ جلوس ہے۔ اس وقت حقیقت خاں متصدی تھا۔ یہ فرمان ٹیکہ بیگم زوجۂ الہ قلی بیگ کو (۳۰) بیگہ زمین برائے مدد معاش سے متعلق ہے۔ [48] بمبئی گزیٹر [49] لطف اللہ شاہ کمال الدین ماتوی کی اولاد سے تھے۔ سجادہ نشینی کا حق

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۲ پر)

علماء، قضاۃ وغیرہ کا اجتماع پایا جاتا ہے۔ اس عہد میں مشائخ کے خاندانوں میں عیدروسیہ، رفاعیہ، چشتیہ، قادریہ، شطاریہ سلسلے کے بزرگوں نے ماضی کی روایات کو زندہ رکھا تھا۔ ان میں سے کئی جید عالم بھی گذرے ہیں۔ شیخ شریف عیدروس ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء ان کے فرزند سید حسن ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء، سید علوی عیدروس ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء، حضرت مولوی کرم اللہ شاہجہاں آبادی ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء، خوب میاں، سید عبداللہ خلف سید نوراللہ قادری، سید عبدالقادر خلف سید عبداللہ قادری، باعلنظہ خاندان کے معلم ابراہیم ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء ان کے بیٹے شیخ علی ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء، شیخ محمد صالح اور شیخ عبدالمجید باعلنظہ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء، قاضی سید اخی (برادر غلام بابا خاں)، قاضی غلام علی ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء، سید غیاث الدین ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء، منشی عبدالحکیم، مولوی برکت اللہ، سید صالح قادری الواعظ ان کے بیٹے سید نظام الدین قادری الواعظ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء اس دور کے چند علماء ہیں۔ ان میں اکثر و بیشتر صاحب تصنیف گذرے ہیں۔ [۳۸]

دوسری جانب رؤسا و امراء نے بھی ادبی سرپرستی سے اس گلشن کو سرسبز و شاداب رکھا۔ سورت کے نواب غلام بابا خاں، سچین کے نواب سیدی ابراہیم خاں محب، نواب سیدی عبدالرحیم خاں اخلاص ان کے بھائی نواب سیدی عبدالغنی غنی بڑے ادب پرور رئیس گذرے ہیں۔ سورت کے عمدۃ التجار خاندان کے شیخ احمد بخشش ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء، ان کے بھائی شیخ فاضل اور فرزند شیخ بہادر بہادر ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء، عمدۃ التجار ملا عبدالغفور کے خاندان کے چشم و چراغ ملا قطب الدین قطب وغیرہ خود شاعر تھے اور شعراء نواز بھی تھے۔ بخشش شاعر کے علاوہ مورخ بھی تھے۔ حدیقۂ احمدی اور حدیقۃ الہند دو ضخیم کتب تواریخ ان سے یادگار ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری کئی کتابوں کے شارح ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ ملا قطب الدین صاحب دیوان شاعر گذرے ہیں [۳۹]۔ ان سے کئی شاعر متوسل تھے جن میں اختر حیدرآبادی قابل ذکر ہیں۔ رؤسا و امراء کی ادبی سرپرستی کی وجہ سے اس عہد میں شعراء کی ایک بڑی تعداد ملتی ہے۔ ان میں سے غلام محمد سمجھو، شیخ عبداللہ منظور، سید علوی العیدروس شاگرد سمجھو، شیفتہ شاگرد علوی، افضل منشی عبدالحکیم کمتر، ان کے بیٹے رضی الدین انگر، سید غیاث الدین شائق اساتذۂ فن کا درجہ رکھتے تھے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۱) انھیں کا تھا لیکن یہ اپنے چچا زاد بھائیوں کے ناروا سلوک کی وجہ سے ترک وطن کرکے عہد شباب میں ۱۸۲۱ء میں سورت آئے اور یہاں ایسے رہے کہ یہیں پیوند خاک ہوئے۔ انگریزی، عربی، فارسی، اردو میں مہارت رکھتے تھے۔ ڈی تاسی سے بھی ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ سورت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کو ہندوستانی پڑھاتے تھے۔ عرصہ دراز تک نواب میر جعفر علی خاں کے مصاحبوں میں رہے۔ نواب موصوف کے بھتیجے میر ابراہیم وفا شاگرد غالب کے اتالیق بھی رہ چکے ہیں۔ سورت کے نواب خاندان میں ان کی شادی ولایتی بیگم سے ہوئی تھی۔ میر جعفر علی کے ساتھ ۱۸۴۴ء میں ولایت بھی گئے تھے۔ انگریزی میں ان کی خودنوشتہ سوانح عمری ان کے ایک شاگرد کپتان ایسٹ وک نے ۱۸۵۸ء میں لندن سے شائع کی تھی۔ ان کا خودنوشتہ مخطوط راقم کے پاس ہے۔ ان کی حویلی بڑے خاں کے چکلے میں اب تک موجود ہے۔ ان کے بیٹے خان بہادر منشی فضل بھی بڑے عالم تھے۔ اسسٹنٹ کلکٹر کسٹم رہ چکے ہیں۔ یہ راقم کی والدہ کے خالو ہوتے ہیں۔

[۳۸] حقیقت السورت اور تاریخ گجرات۔

[۳۹] راقم کی والدہ کے دادا ہیں۔

[۴۰] دیوان کا مخطوطہ راقم کے پاس ہے۔ راقم کے ننھیالی عزیزوں میں سے ہیں۔ اس خاندان پر راقم کا ایک مضمون رسالہ شاعر بابتہ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔

سمجھو اس دور کے اساتذہ میں سب سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔ سمجھو نے بھی اپنے مبلغ علم کی کمی کی وجہ سے علماء کی صحبتوں میں باریابی حاصل نہ ہونے پر بڑی عمر میں منشی لطف اللہ کی طرح تحصیل علوم کی تھی۔ سمجھو شہزادہ جہاندار شاہ کی حج بیت اللہ سے واپسی پر ان کی معیت میں دہلی گئے تھے اور دربار میں قصیدہ پڑھ کر خلعت حاصل کیا تھا[49]۔ قیام دہلی کے دوران میں ذوق و مومن سے سمجھو نے مشورہ سخن بھی کیا تھا۔ نظم و نثر میں یہ کئی تصانیف کے مالک ہیں[50]۔ سمجھو کے شاگرد منظور ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء اور سید علوی ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء دونوں اپنے استاد کی زندگی ہی میں استادوں کی صف میں جگہ پانے کے قابل ہو چکے تھے۔ ان کے شاگردوں کی بھی کثیر تعداد تھی۔ منظور اور ان کے استاد سمجھو دونوں کو نواب بچن اور نواب سورت کے درباروں سے تعلق تھا۔ منظور سے بھی نظم میں کئی تصانیف یادگار ہیں۔ ۱۸۶۰ء میں انھوں نے سورت سے ایک اخبار منظور الاخبار کے نام سے جاری کیا تھا۔ منظور کے سیاح سے بڑے گہرے مراسم تھے۔ سیاح نے غالباً ۷۲-۱۸۷۱ء میں قیام لکھنؤ میں ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے ؎

ہے شاد شاد مقدم جاناں سے تن میں روح   آتے ہی اس کے جا کے پھر آئی بدن میں روح   (غزل نمبر ۲۵)

یہ غزل کسی طرح سورت پہنچ گئی جس پر منظور نے بھی غزل کہی ہے۔ غزل یہ ہے :-

تحریک باد سے نہیں سرو چمن میں روح   آنے سے تیری پڑ گئی جانان چمن میں روح

اے ضعف دگر یہ بحر جہاں میں ہوں کوئی دم   باقی ہے جوں حباب میرے پیرہن میں روح

ماتم میں ہر دو ماہ تہ و بالا ہوئے وہاں   نکلی کسی حسین کی گر بالا پن میں روح

دشت جنوں ہے گور بن اویس؟   غربت میں جسم مردہ ہے اور ہے وطن میں روح

باد لطیف کیوں نہ مقدر ہو خاک سے   ہے قرب سے کثیفوں کے رنج و محن میں روح

شاعر مقیم اور چلے جائیں شعر دور دور   اعجاز سے وہ بھرتے ہیں گویا سخن میں روح

سیاح ہند سے جو ہیں سورت میں آرہے   منظور آگئی مرے مردہ تن میں روح[53]

سورت کے اس علمی ادبی ماحول میں سیاح کی زندگی کا بڑا حصہ گذرا تھا۔ اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ سورت کے اکثر اہل ذوق دہلی کے اساتذہ سے تعلق، تلمذ اور مراسم دوستانہ رکھتے تھے لیکن جب اس دور کے ادبی خزانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر دبستان لکھنؤ سے زیادہ متاثر تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ طرز معاشرت میں بھی اہل سورت نے لکھنؤ ہی کا تتبع کیا ہے۔

سیاح کا کلام اسی ماحول کی آئینہ داری کرتا ہے۔ آیئے اب ان کے کلام کی خصوصیات کا جائزہ لیں۔

غالب کے دور کی ایک مشترک خصوصیت مضمون آفرینی رہی ہے۔ اس دور کے اساتذہ نے اس میں اپنے کمال کا ثبوت دیا ہے۔ مگر ان فنکاروں کے شاگردوں میں سے کسی کو یہ سعادت نصیب نہ ہوئی۔ ان لوگوں نے صرف بعض مضامین کے ادا کرنے میں جدت و ندرت دکھلائی ہے۔ سیاح کے کلام میں بھی ایسی چند مثالیں ملتی ہیں ــــ

تصور آنکھ میں ہے اس کے روئے روشن کا   مگر نظر نہیں آتا کبھی نظر کی طرح

---

[49] تاریخ گجرات مرتبہ عبدالرحمٰن عیدروس (مخطوطہ)۔   [50] تاریخ گجرات از عیدروس۔

[53] قلمی بیاض مملوکۂ راقم۔

اس بے کسی میں میری رفاقت جو تم نے کی
جان اپنی تم پہ کرتا ہو رنج و محن نثار

یہاں تک پھیل کر بہتا ہے دریا میرے آنسو کا
نظر آتی نہیں اس پار سے اس پار کی صورت

ناکام ہیں اس عصر میں سب طالب دنیا
گو ظرف میں شیرینی کے ہیں مثل مگس بند

شمیم طرۂ مشکیں و تاب عارض سے
کبھی فراق رہا اور کبھی وصال ہوا

سیاح کو زبان پر قدرت حاصل تھی۔ بہ اعتبار زبان ان کا کلام کئی خوبیوں کا حامل ہے۔ فرسودہ مضامین بھی نہایت سادگی و صفائی سے ادا کر جاتے ہیں۔ ترکیبیں سیدھی سادی ہوتی ہیں مگر اشعار شگفتہ نکلتے ہیں:۔

کل کچھ تھا آج اور ہے نقشہ جہان کا
ہر روز اک بدلتا ہے رنگ آسمان کا

آئے قفس میں جب سے کہیں تم سے یار کیا
سب ہم کو ایکساں ہے خزاں کیا بہار کا

خدا نے عشق میں ثابت قدم رکھا ہم کو
اٹھے نہ منزل جاناں سے سنگ در کی طرح

ہے یہی مہر و محبت سیاح
جو یہ محبوب کیا کرتے ہیں

جور و ستم بتوں کے اگر ہیں اسی طرح
کرتا ہے آج کل ہی میں یہ جاں نثار کوچ

سیاح کو روزمرے اور محاورے کھپانے کا بے حد شوق تھا۔ کسی جگہ بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے لیکن ہر جگہ سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے جس کی وجہ سے اشعار میں لطافت پیدا ہو گئی ہے۔

وہ سبق کے پاک محبت کا نام لیتے ہیں
ہماری جان کو لو یہ بھی پارسا نکلا

رفتہ رفتہ خار صحرا سر اٹھاتے جاتے ہیں
دیکھئے کیا رنگ لاتے ہیں یہ خار اب کے برس

کس پہ میں تکیہ کروں کوئی نہیں اس کے سوا
دوست پر دوست کیا کرتے ہیں اکثر تکیہ

چراتے ہو نظر کیوں اجنبی تو کچھ نہیں ہیں ہم
ہمارے آپ کے مدت سے ایک صاحب سلامت ہے

مجھ کو دم دے کے لے گئے دل و جان
کون کہتا ہے ان کو ناداں ہیں

تشبیہ و استعارے کے استعمال میں کسی قسم کی ندرت نہیں پائی جاتی۔ زیادہ تر پرانی تشبیہوں کا استعمال کیا ہے۔

نظر نہ آیا کبھی وہ ہمیں نظر کی طرح
ہمیشہ چشم سے وا حلقہ ہائے در کی طرح

تلوے غربال ہوئے خاروں کے صدمے سے مرے
چھانتا پھرتا ہوں میں خاک بیاباں اب تک

عطر کی دیگ کا سرپوش بنا کاسۂ سر
زلف مشکیں کے ہے سودے کا بس جوش مجھے

پیاسا ہے دل بیتاب اس کے آب پیکاں کا
ہر اک زخم بدن کھولے ہے منہ سوفار کی صورت

سیاح مناسبت لفظی کے بڑے شائق تھے۔ یہ دبستان لکھنؤ کا اثر ہے۔ محاوروں کی طرح اس کا بھی استعمال ان کے کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے مگر محاوروں کے استعمال کی طرح ایسے اشعار میں شگفتگی پیدا نہ ہو سکی۔

ملا نہ عید کو آ کر گلے وہ مہ پارہ
جگر خراش مرا ناخن ہلال ہوا

یار کی نازک مزاجی کا ہے بل سیاح سب
زلف چھو لیتا جو ڈرتا نہ مجھ کو مار کا

عمر روتے ہی کٹی ہجر میں ایک مہر و کے
برج آبی میں ہے مدت سے ستارہ اپنا

سخت جانی سے میں عاری ہوں نہایت لے ترک
پڑ گئے ہیں تیری شمشیر میں دندانے دو

نافۂ آہو اگر اس کو کہیں تو ہے خطا مشک و عنبر میں نہیں بو تیری کاکل کی طرح

سیاح کے ہاں حسن و عشق اپنے محدود معنوں میں مستعمل پائے جاتے ہیں۔ بعض جگہ تو ان کا عشق بالکل جنسی بھوک، اور محبوب بازاری معلوم ہوتا ہے۔ سیاح ہی اس گنہ کے مرتکب نہیں، ان کے دور کی یہ عام خصوصیت تھی۔ بعض غزلوں میں بلند درجہ اشعار نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے:۔

لیا بوسہ جو ابرو کا تو کیا کیا غیظ میں آکر کبھی دیکھی مری صورت کبھی تلوار کی صورت

الٰہی آنکھ اس ظالم کو دیکھا جس نے کوچے پہ جگہ سے اپنی ہل سکتا نہیں دیوار کی صورت

پھبتی کہی ہے یہ سرپستان یار پر سوسن کا پھول رکھا ہوا ہے انار پر

سمجھے یہ رمز اشارہ ہے کہ ہم بستر ہو اس نے مارا ہے شب وصل جو جھک کو تکیہ

شب بعیس بدل کر ہم گھر میں جو گئے اس کے غل تھا کہ یہ کون آیا فریاد تھی "ہے ہے" تھی

ان کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ مشکل زمینوں میں شگفتہ اشعار کہے ہیں۔ اسی طرح بعض جگہ ٹیڑھے قافیوں کو بھی خوش اسلوبی سے کھپایا ہے۔ جیسے قمر میں تنکا، جگر میں تنکا، ناکس وکس بند، حرص وہوس بند، ہوا پر پلکیں، شہپر پلکیں، چوکھٹ کے سنگ سے، پائے لنگ سے، تن زار میں گرمی، دل بیمار میں گرمی وغیرہ۔

سیاح کی خصوصیات کلام کے اس سرسری جائزے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا کلام دہلوی اور لکھنوی دونوں دبستانوں سے متاثر ہے۔ اگرچہ یہ غالب کے شاگرد تھے لیکن بہ اعتبار خیال لکھنؤ اسکول کی پیروی کرتے ہیں اور بہ اعتبار زبان ان کا کلام دونوں اسکولوں کی خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ ان کے ہاں جذباتی شاعری کا فقدان ہے۔ درد وغم سے متعلق معدودے چند اشعار ملتے ہیں۔ ان اشعار میں بھی سوز وگداز نام کو نہیں۔ حسن بھی اپنے محدود معنوں میں پایا جاتا ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے سیاح کے کلام کا درجہ بلند ہے۔ محاورہ اور روزمرہ کے استعمال کی وجہ سے زبان میں چٹخارہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ہمارے سامنے ان کا بہت تھوڑا کلام ہے لیکن اس سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نہایت پرگو شاعر تھے۔ مجموعۂ کلام میں طویل غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مشکل زمینوں میں شگفتہ اشعار کہہ کر بھی اپنی قدرت زبان کا ثبوت پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاح صرف زبان کے خیال سے ہی شعر کہتے تھے۔ خیال و جذبے کی ان کے ہاں زیادہ وقعت نہیں تھی۔

تکملہ

از: جناب قاضی عبدالودود صاحب۔ بار ایٹ لا۔ پٹنہ

(۱) غالب کے کلیات نثر فارسی طبع سنہ ۱۸۶۸ء میں نواب میر غلام بابا خاں کے نام ایک خط مرقومہ ۱۷؍ مئی سنہ ۱۸۶۴ء درج ہے جو کلیات کے اس نسخے میں جو غالب کے دوران حیات میں چھپا تھا شامل نہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ نولکشور کو یہ خط سیاح سے ملا ہوگا۔ اس کی عبارت ذیل سے جو سیاح کے بارے میں ہے پتہ چلتا ہے کہ تاریخ تحریر تک سیاح کی شادی نہیں ہوئی تھی:۔

"سیاح جہاں گرد را بند گراں بر پائے زہیں پیماے نہادہ اند، چناں کنند کہ دوش دے زیر بار تیمار عیال نفرساید، و از بند اندوہ آزاد باشد۔ دانم کہ ہم چنیں خواہد فراوانی محبت بر ایں داشت۔"

خط مذکور کے بعد کلیات میں ذیل کی عبارت ہے جو غالباً سیاح کی لکھی ہوئی ہے۔ میرا قیاس ہے کہ اس میں نولکشور سے خطاب ہے اور غلطی سے درج کتاب ہو گئی۔

"اڑا جاؤں، کیا دیوانہ ہوں؟ لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں آپ کی عنایت سے اور بزرگوں کی دعا سے خوش و خرم ہوں اور اپنی (کذا) عزت و آبرو سے بسر کرتا ہوں۔ خدا ایک وقت تم کو یہاں لاوے تو سب حال کھل جاوے۔ زیادہ کہنا زیادہ ہے۔"

(۲) کلیات نثر غالب طبع سنہ ۱۸۶۸ء کا آخری خط نولکشور کے نام سے ہے اور اس کی تاریخ کتابت ۱۸؍ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء ہے۔ اس میں میاں داد خاں سیاح کو دعا لکھی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غالب و سیاح کے تعلقات کا آغاز ۱۸؍ جولائی سے پیشتر ہو چکا تھا۔ قیاس یہ بھی چاہتا ہے کہ اس وقت سیاح لکھنؤ میں ہوں۔

(۳) سیاح اور نولکشور مالک اودھ اخبار لکھنؤ کے تعلقات دوستانہ تھے اور اس اخبار میں سیاح کی نظم و نثر اور ایسی چیزیں جن سے ان کا کسی قسم کا تعلق ہے گو وہ خود اس کے لکھنے والے نہ ہوں شائع ہوا کرتی تھیں۔ اس کے کل قدیم مجلدات پیش نظر ہوں تو یقین ہے کہ ان کی ایسی نظم و نثر دستیاب ہو جو عام دسترس سے باہر ہے اور ایسے حالات کا پتہ چلے جو اب تک پردۂ اخفا میں ہیں۔ اس وقت سنہ ۱۸۷۳ء، سنہ ۱۸۷۵ء اور جنوری تا جون سنہ ۱۸۷۶ء کے مجلدات میرے سامنے ہیں اور سطور ذیل انھیں کے مطالعے پر مبنی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ان مجلدات کے بعض شمارے غائب ہوں اور جو شمارے ہیں ان میں سے بعض نامکمل ہوں۔

۱۷؍ جنوری سنہ ۱۸۷۳ء ــ میر ابراہیم علی خاں (بڑودہ) کے بیٹے کی رسم ابجد خوانی کے موقع پر غلام بابا خاں شریک تھے۔ سیاح بھی ضرور حاضر ہوں گے۔ اخبار میں "رودادِ جشن" کے ساتھ سیاح و سالک دہلوی وغیرہ کی نظمیں بھی ہیں جو اس موقع پر

لکھی گئی تھیں۔ سیاح کا سہرا:۔

رخ پہ دولہا نے عجب رنگ کا باندھا سہرا — طرۂ مہر درخشاں پہ ہے طرہ سہرا[۵۵] (۱۱ اشعار)

اسی شمارے میں سالک دہلوی کا ایک طویل خط شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ اخبار کے بعض شماروں میں ایک مضمون درج ہوا تھا " موجد اس مضمون عالی کے محمد وجاہت علی خاں مہتمم اخبار عالم نے یہ رائے درج اخبار عالم فرمائی کہ مکرمی محمد میاں داد خاں ...... سیاح نائب و مصاحب ..... نواب میر غلام بابا خاں ..... جن کے اوصاف حمیدہ ..... مشہور ..... ہیں اور سیاحت میں بھی سیاحان جہاں سے بہتر اور علم وفضل میں امثال و اقران میں برتر ہیں ان کے لئے بہ تجویز احباب کوئی خطاب ہونا چاہیئے "۔ سالک کا بیان ہے کہ غلام محمد خاں تپش مدیر اودھ اخبار کی رائے ہے کہ " جس طرح گورنمنٹ سے خطاب عطا ہوتے ہیں اسی طرح اہالیان انجمن وسوسائٹی سے بھی اہل کمال کے لئے تجویز ہوا کریں اور گورنمنٹ اس کی منظوری فرمایا کرے "۔ اسی شمارے میں بھی اودھ اخبار نے اس کی تحریک کی کہ اہل کمال کو خطاب ملیں تائید کی ہے۔

۱۴ر فروری ۱۸۷۳ء میر غلام بابا خاں کی ایک تحریر جس میں خطاب سے متعلق تحریک کی تائید کی گئی ہے مگر اس میں سیاح کا نام نہیں آیا۔

۲۶ر اگست ۱۸۷۳ء۔ سیاح کا یہ قطعہ درج ہے:۔

خاکساری کا مری باعث نہ لے سیاح پوچھ — خاطر احباب سے میں نے اٹھایا ہے غبار
کام آ جائے اگر احباب کے آ جائے کام — ورنہ جیب زندگی میں نقد جاں کو جاں ہے عار
دوستوں کو دیکھ کر خوش مجھ کو ہوتی ہے خوشی — دوستوں کا رنج کرتا ہے مجھے غم سے دوچار
خندۂ احباب نے مجھ کو لب خنداں دیا — گریۂ احباب نے بخشی ہے چشم اشکبار
ہوں رضا جو دوستان بے ریا کی رائے کا — شیوۂ تسلیم میں نے کر لیا ہے اختیار
گفتگوئے ظاہری سے بھاگتا ہوں دور دور — نے نفاق اندیشہ ہوں میں نہ منافق کا ہوں یار
مجھ کو نخوت ہے ولیکن اس کی ہے تذلیل کو — چشم کم سے دیکھ کر جو جانتا ہے مجھ کو خوار
دام دولت میں پھنسائیں گر مجھے اہل غرور — تیر اشکبار میرا ان کے دل میں ہو دو سار
دو دن کی لیتا ہے میرے سامنے جس دم کوئی — میں بھی اس کے واسطے لیتا ہوں گردوں افتخار
ظاہر آرائی سے ہے نفرت مجھے بیزار ہوں — بد کہے مجھ کو جہاں یا نیک سمجھے روزگار
جانتا ہوں نیک و بد سب اسکی ہی قدرت میں ہے — چھوڑ رکھے ہیں خدا پر میں نے اپنے کاروبار

۴ر ستمبر ۱۸۷۳ء۔ گلگشت سیاح نوشتۂ سیاح کی ابتداء میں مدیر نے لکھا ہے کہ " حضرت سیاح کو غالباً کوئی سال بغیر سیر و سفر کے نہیں گزرتا "۔ تمہید " گلگشت سیاح " جس کا آغاز شعر غالب سے ہے!

اگر بدل نخلد ہرچہ از نظر گذرد — زہے روانی عمرے کہ در سفر گذرد

جو کہ (کذا) ایک مدت سے شوق سیر وسیاحت دیار امصار دامنگیر خاطر نیاز ماثر ہے لہذا اکثر مقامات نامی گرامی ہندو دکن و سندھ و پنجاب و بنگالہ وغیرہ کی خاک چھانی ہے اور آج تک وہ کیفیت دشت گردی و لذت صحرانوردی گوشۂ خاطر

---

[۵۵] اودھ اخبار میں نمبر ۱۵ کے اشعار نمبر ۳ اور ۷ نہیں ہیں (ظہیر)

سے دور نہیں ہوتی ہے۔ ہمیشہ کمر عزم کو چست اور کمر بند عزم بالجزم کو درست باندھے ہوئے عبائے ہمت بر دوش و حلقۂ مسافرت در گوش رکھتا ہے۔" خلاصہ! میر باقر علی خاں[۵۵] قدیم رئیس و رکن اعظم ریاست بڑودہ تھے لیکن مہاراجہ سے نااتفاقی کی بدولت بمبئی و سورت وغیرہ میں مقیم تھے۔ یہ مہاراجہ گوالیار کے کچھ دن مہمان رہنے کے بعد سورت آئے اور وہاں سے عازم بمبئی ہوئے تو سیاح بھی ان کے اصرار پر ساتھ ہوگئے۔ بمبئی میں فاضل بھائی (قوم خوجہ) برادر نواب سچین[۵۷]، مرزا اکبر علی بہادر[۵۸]، حاجی اسمٰعیل سیٹھ نے دعوتیں کیں اور منشی امان علی مہتمم کشف الاخبار سے ملاقاتیں رہیں۔ حاجی اسمٰعیل سیٹھ کے بنگلے میں مقیم ہوئے اور سید محمد صدیق کی معیت میں شہر کی سیر کی۔ بمبئی سے دونوں پونا پہنچے اور وہاں چند دن رہ کر پھر وارد بمبئی ہوئے جہاں ایک دن مرزا اکبر علی خاں کے مہمان رہے اور پھر بتاریخ ۱۵ اگست سورت واپس آگئے۔ سیاح نے لطف سفر خوب اٹھایا لیکن ایک مدت کا جمع کیا ہوا سرمایۂ سخن جو کچھ جزو تھا میر صاحب کی بکری مسماۃ چھو پالی (کذا) نذر ارکر گئی...... ایک وقت میر صاحب کا سو روپے کا نوٹ نوش جاں کر گئی۔

۱۵ ستمبر ۱۸۷۳ء میں سیاح کی ایک تحریر ارچہ بافی کی کمپنی سے متعلق ہے جو سورت میں میر غلام بابا خاں نے قائم کی تھی۔

۲۸ نومبر ۱۸۷۳ء میں سیر سیاح کی قیمت ڈھائی آنے درج ہے۔

۱۴ فروری ۱۸۷۵ء۔ مدیر نے ایک تحریر سیاح کے متعلق لکھی ہے جس میں بتایا ہے کہ انھوں نے لیڈی ہوبرٹ (زوجہ گورنر مدراس) کو مدحیہ قصیدہ سنایا اور انھوں نے بہت تعریف کی تو سیاح صاحب نے عرض کیا کہ آپ کی (اشارہ بہ لیڈی ہوبرٹ) خوشنودی کا ثمرہ مجھ کو ملنا چاہیے۔ جس میں میری نام آوری اور آپ کی قدردانی ایک عالم پر روشن ہو۔ فرمایا کہ جانا چاہتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ نہیں یہاں سے حیدرآباد اور حیدرآباد سے سورت کا قصد ہے۔ فرمایا تم بہت اچھی طرح سے سورت پہنچ جاؤ گے۔ عرض کیا بندہ زر و جواہر، روپے وغیرہ کا طالب نہیں ہے۔ فقط دنیا میں نام آوری اور ہمچشموں میں آبرو و افتخار چاہتا ہوں۔ میں لارڈ صاحب کو قصیدہ سنا کر بذریعہ سکرٹری خبر دوں گی۔ پھر سیاح نے رخصت طلب کی۔ ارشاد ہوا میں سورت آؤں گی تو تم سے ضرور ملوں گی۔

۲۱ مئی ۱۸۷۵ء۔ سفرنامہ حضرت سیاح میں اشعار ذیل ملتے ہیں جو یقین ہے کہ خود سیاح کے ہیں۔

عزم کچھ لکھنے کا جو کرتا ہوں	دل سے لاریب اپنے ڈرتا ہوں
حاسدوں کا فقط ہے اندیشہ	کہ ازل سے ہیں وہ حسد پیشہ
نہیں جو کہیں گے اپنی بانی سے	معترض ہوں گے مہربانی سے
قول سعدی جو مجھ کو یاد آیا	حسب حال اس مقام پہ لایا
خوے بد در طبیعتے کہ نشست	نرود جز بوقت مرگ از دست

۲۸ دسمبر ۱۸۷۴ء۔ ۱۸ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ سورت سے بمبئی پہنچے اور نواب سیدی عبدالغنی خاں رئیس سچین کے مہمان ہوئے۔ ۱۸۷۵ء کی ۳ جنوری کو یہ پونا گئے جہاں سیٹھ محمد صدیق کے یہاں مقیم ہوئے۔ پونا میں محمد عمر اور مرزا محمد بیگ نے ان کی دعوت کی اور یہ تیسرے دن یہاں سے روانہ ہوئے۔ راہ میں پانچ گنی اور کڑا پا ملتا تھا۔ یہاں ٹھیرتے ہوئے مدراس

---

[۵۵] و [۵۶] ضمیمہ نمبر ۲ [۵۶]

[۵۷] نواب جعفر علی خاں کے دیوان و مشیر کار تھے۔

پہنچے۔ مولانا جناب حسن بھائی زکی الدین نے جعفرجی[۵] طیب علی تاجر کو ان کے ارادۂ مدراس کی اطلاع دے دی تھی اور یہ انھیں کے مہمان ہوئے۔ ورود مدراس کے تیسرے دن ان کے دوست احمد محی الدین انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کا مسکن شہری آبادی سے ۲ میل کے فاصلے پر تھا۔ "وہاں چند درخت ناریل کے اور ایک گڑھا برسات کے پانی سے بھری ہوئی زمین افتادہ، ایک چھپر گھاس کا نوساخت چو طرف سے کھلا ہوا۔ اس میں دو چار کرسیاں ایک دو کوچ پڑے ہوئے تھے۔" سیاح کی تواضع ایک پیالہ چائے اور بسکٹوں سے کی گئی۔ اس شام کو لیڈی ہوبرٹ زوجہ گورنر مدراس نے باغ میں مجلس کی تھی۔ احمد محی الدین سیاح کو ساتھ لے کر اس نیت سے باہر نکلے کہ موقع ملا تو وہاں[۶] چلیں گے۔ "باغ پہنچے تو دونوں نے اپنے نام کے کارڈ بھیجے اور لیڈی صاحبہ نے عذر اجازت باریابی دی۔" وقت ملاقات سیاح کا حال دریافت کیا اور اپنا چمن دیکھنے کو کہا۔ سات بجے دونوں واپس ہوئے۔ "اکل و شرب کے بعد سونے کی نوبت آئی تو پلنگ میں کھٹمل بہت تھے۔ زمین پر بستر بچھایا تو چوہوں نے تنگ کیا۔ آخر باہر کے چھپر میں جاکر کچھ راحت پائی۔" صبح کو میزبان کے پھر بسکٹ اور چائے پیش کی۔ ان کے ہم زلف میرزا مرزا علی سے ملاقات رہی اور دن کے کھانے کے بعد احمد محی الدین سیاح کو ان کی فرودگاہ میں چھوڑ گئے۔ اس کے تیسرے دن لیڈی ہوبرٹ کا دعوت نامہ ملا اور دس بجے شب کے قریب شریک دعوت ہوئے۔ لارڈ ہوبرٹ (گورنر) سے ملایا اور گورنر ایجنٹ مسٹر مرلی (کذا) سے بھی تعارف ہوا۔ اثنائے گفتگو میں شاعری کا ذکر آیا تو لیڈی ہوبرٹ بولیں "میں پہلے ہی سمجھتی تھی کہ تم بڑے شاعر ہو۔" سیاح نے جواب دیا "میں ہرگز شاعر نہیں ..... آپ ...... قدردانی فرماتی ہیں۔" ایجنٹ صاحب بہادر فارسی کا مذاق رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ لیڈی صاحبہ دریافت کرتی ہیں کہ تم غزل لکھتے ہو یا مثنوی۔ سیاح نے کہا "جب آپ نے ..... از راہ مسافر نوازی شاعر قرار دیا تو غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، مسدس، مخمس، مثلث، مثمن، مرثیہ، نوحہ، قصیدہ، ہجو وغیرہ سب کچھ لکھ سکتا ہوں۔" ارشاد ہوا کہ کچھ لائے ہو۔" انھوں نے کہا کہ اس وقت تو کچھ پاس نہیں فرصت ملی اور اطمینان رہا تو چند شعر لکھ کر ضرور نذر کروں گا۔" یہاں سیاح کی ملاقات مرزا فیروز حسین خاں بہادر دہلوی اور میر حسین علی خاں میر منشی گورنمنٹ ایجنٹ سے بھی ہوئی۔ مگر احمد محی الدین کشیدہ نظر آنے لگے۔ صبح کو میرزا صاحب اور عزیز یار جنگ معہ مصاحبین ان سے ملنے آئے اور اپنے ساتھ لے گئے۔ ارباب نشاط (ملازمین قدیم) کا گانا سنوایا اور گیارہ بجے کے قریب انھیں ان کی قیامگاہ پر پہنچوا دیا۔ اس کے بعد روزانہ جلسۂ رقص و سرود ہوا کیا۔ "ایک روز شب کو علاوہ مہمان نوازی ہر روزہ کے سیٹھ جعفرجی طیب علی نے اپنے باغ میں بڑی دھوم سے ان کی خاص طور پر دعوت کی جس میں معززین شہر شریک ہوئے۔ مدراس سے بنگلور گئے۔ مرزا صاحب نے اپنے دوست نواب حسین علیخاں سلطان متخلص بہ تسنیم کو اطلاع دے دی تھی وہ اسٹیشن آکر انھیں ساتھ لے گئے۔ یہاں جناب غم مہتمم بنگلور اخبار اور حافظ سید محمد مالک میسور اخبار سے ملنا ہوا۔ جناب سے نواب صاحب متخلص تسیم (کذا) نے اپنے بھائی سراج الدین علیخاں کو خط لکھا دیا تھا۔ سیاح بنگلور سے میسور گئے تو انھیں کے یہاں ٹھہرے۔ یہاں سے میزبان اور شیخ داؤد سلطان محی الدین کی معیت میں سرنگاپٹن گئے اور وہاں کی

---

[۵] سیاح نے ان کے بیٹے کا نام فدا حسین لکھا ہے۔ (عبدالودود)

[۶] یہ معلوم ہوتا ہے کہ احمد محی الدین کے نام دعوت نامہ آیا تھا۔ انھوں نے سیاح کو ساتھ لانے کی اجازت چاہی ہوگی، سیاح کی تحریر سے یہ بات واضح نہیں ہوتی۔ (عبدالودود)

قابلِ دید چیزوں کو دیکھ کر بنگلور ہوتے ہوئے مدراس واپس گئے اور وہاں پہنچ کر ایک چٹھی گورنر کے پرائیوٹ سکریٹری کو اس مضمون کی لکھوائی کہ میاں داد خاں سیاحؔ پرائیوٹ سکریٹری نواب صاحب سورت حسبِ وعدہ قصیدۂ مدحیہ سنانا چاہتا ہے۔ ۹ر فروری کو ایک بجے حسب الحکم ایوانِ گورنری میں پہنچے۔ ایڈی کانگ نے ان کا استقبال کیا۔ لیڈی ہوبرٹ سے ملاقات ہوئی تو ان سے ہاتھ ملایا۔ "خریطۂ قصیدہ نذر کیا" موصوف نے ہندوستانی زبان میں فرمایا "آپ کا مزاج شریف اچھا ہے؟" سیاحؔ نے شکریہ ادا کیا۔ یہ ان کے قریب ہی ایک کرسی پر بٹھائے گئے۔ لیڈی صاحبہ کا ہندوستانی سکھانے والا استاد طلب کیا گیا اور سیاحؔ سے قصیدہ اور اس کا ترجمہ استاد سے سنا گیا۔ لیڈی صاحبہ نے تعریف کی اور کہا کہ "لارڈ ہوبرٹ شرکتِ کونسل کے لئے گئے ہوئے ہیں وہ آئیں گے تو انھیں یہ قصیدہ سناؤں گی بعدہٗ تم کو سکریٹری صاحب جواب دیں گے۔" سیاحؔ نے کہا کہ "میں آپ کو لارڈ بہادر سے جدا اور کم نہیں جانتا ہوں اس وقت میرے لارڈ صاحب آپ ہی ہیں۔" اس کے بعد مصافحہ کر کے رخصت ہوئے۔ سکریٹری اور ایڈی کانگ گاڑی تک پہنچا گئے۔ سیاحؔ کا بیان ہے کہ میں نے "از روئے محبت" احمد محی الدین کے یہاں جا کر یہ باتیں بتائیں تو کیا لکھوں کہ سن کر کیا نقشہ ان کا ہوا۔ گورنر اور ان کی زوجہ نے شکریئے کا خط بھجوایا جو بجنسہ اس کے انگریزی اخبار میں طبع ہوا۔ سیاح کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا تو زبانی پیام آیا کہ آپ کو ایک لاکٹ "بطور یادگار" دینے کی تجویز ہوئی ہے۔ سیاحؔ مدراس سے رخصت ہو کر پہلی مارچ کو حیدرآباد پہنچے۔ اسٹیشن پر سالک دہلوی اور حافظ غلام حسین خاں (جو میرزا صاحب کے دوست تھے اور جنھیں بذریعہ تار اطلاع دی گئی تھی) موجود تھے۔ پہلے حافظ صاحب کے یہاں گئے اور کھانا کھایا اور بڑی منت وسماجت سے سالک کے یہاں قیام کی اجازت ملی۔" مولوی عنایت الرحمٰن خاں" اور سیاح کے "استاد قدیم" دولھا میاں صاحب نے ان کی دعوت کی۔ اور "مولوی ہدایت اللہ خاں" کا بیانہ دوران قیام میں برابر ان کی سواری میں رہا۔ ببر الملک ہٹانگ فرینرسے ملے تو انھوں نے "شیر کے ناخن کا ایک عطردان بطور یادگار ...... سونے میں منڈھا کر بھیجنے کا وعدہ کیا۔" انھوں نے اس کا انتظام بھی کر دیا کہ انھیں مختار الملک (سالار جنگ) وقار الامرا اور شمس الامرا کی ملاقات بڑی رد و قدح و بار یک بینی کے ساتھ حاصل ہوئی۔" حیدرآباد سے رخصت ہوتے وقت اسٹیشن پر سالک کے علاوہ مولوی زکی الدین خاں ...... و لالہ ہیرا گر بھی تھے۔ ۲۰ر مارچ کو یہ بمبئی پہنچے اور منشی سابق نواب چھین کے مہمان ہوئے۔ نولکشور بھی بمبئی میں موجود تھے۔ انھوں نے سیاحؔ کو مہاراجہ جے پور سے ملایا۔ ایک دن قمر الدین وکیل ہائی کورٹ نے ان کی دعوت کی۔ جس میں افضل اللہ خاں (کانسل ایران) مرزا علی اکبر خاں، میر قربان علی (وکیل مہاراجہ جے پور) شجاع الدین، حسن علی نجم الدین، سید احمد وغیرہ شریک تھے۔ ۳۱ر کو سورت پہنچے اور "آقائے نامدار کی ملازمت حاصل کی۔" تو ان سے معلوم ہوا کہ گورنر مدراس کی جانب سے ایک لاکٹ اور چٹھی آئی ہے۔ لاکٹ میں لارڈ اور لیڈی ہوبرٹ کی تصویریں تھیں۔ سیاحؔ نے چٹھی کا ترجمہ بھی درج کر دیا ہے کہ حاسدوں کو ندامت ہو۔

۶ر جون ۱۸۷۵ء — لارڈ ہوبرٹ کی وفات پر سیاح کی تحریر۔

۹ر جون ۱۸۷۵ء — سیاحؔ نے احمد محی الدین کے متعلق جو کچھ لکھا تھا۔ اس پر شمس الاخبار مدراس میں انھیں لے دے کی گئی تھی۔ جس کا جواب منشی امان علی مہتمم کشف الاخبار بمبئی نے دیا تھا۔ "عمدہ الاخبار شاہی" (کذا) مدراس میں بھی سیاحؔ کی خبر لی گئی تھی۔ جس کے جواب میں سید محمد نے جو بظاہر سورت کے باشندے تھے ایک تحریر ۹/۶ ۱۸۷۵ء کے اودھ اخبار میں چھپوائی تھی۔ وہ بھونے پر لعنت بھیج کر لکھتے ہیں کہ لیڈی ہوبرٹ سے سیاحؔ کی ملاقات کے وقت میں "منشی صاحب" (سیاح) ..... کی خدمت میں حاضر ..... تھا چشم دیدہ عرض کرتا ہوں کہ برابر ایڈی کانگ نے گاڑی تک سبقت کی اور گاڑی کا دروازہ اپنے ہاتھ سے کھول کر منشی صاحب کو اتارا۔

اور بغل میں ہاتھ لئے ہوئے ایوان گورنری میں پہنچایا اور کرسی بھی لیڈی صاحبہ کے قریب رکھی اور وقت مراجعت سوائے ایڈی کانگ کے کپتان آڈری پرائیوٹ سکریٹری بھی گاڑی تک رخصت کرنے آئے تھے۔" نامہ نگار نے اس کی تردید کی ہے کہ سیاح نے چار خط گورنر کو لکھے۔ وہ صرف تین کا اقرار کرتے ہیں۔ احمد محی الدین کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ وہ "اپنے تئیں بذریعہ اخبار داماد پرنسی آرکاٹ مشہور کرتے ہیں۔" اگر یہ حقیقت ہے تو وہ ننگ خاندان ہیں اس لئے کہ وہ کئی بار جہینہ دو مہینہ محبس خانے کو رونق بخش آئے ہیں اور میرزا فیروز حسین چھڑا چھڑا لائے ہیں۔ ایک بار چشم پوشی کر گئے تھے جس کا خمیازہ اب تک اٹھا رہے ہیں یعنی مورد عتاب و خطاب ناشائستہ ہیں۔" عمدۃ الاخبار میں سیاح کے متعلق چھپا تھا کہ پچاس ساٹھ روپے کے نوکر گمنام اور ہیچمداں ہیں۔ نامہ نگار کہتا ہے کہ "اب للہ ذرا احمد محی الدین کا بھی ملیہ ظاہر فرمائیے۔" دوران قیام مدراس میں عمدۃ الدولہ بہادر عرف نور اللہ میاں نے سیاح کو طلب کر کے ان سے ملاقات کی تھی۔ اس تحریر میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ بات سیاح سے سفرنامے میں سہواً قلم انداز ہوگئی ؎۔ عبارت ذیل لطائف غیبی کی بعض عبارات سے بہت مشابہ ہیں:۔

"کیا تم کو نہیں معلوم کہ تمام ہندوستان کے وقائع نگار جناب سیاح صاحب کے عنایت فرما و کرم گستر ہیں۔ میری زندگی تلخ کر دیں۔ غرض اس تحریر و تقریر سے ثابت ہوا کہ کنج خمول سے باہر آئیں اور ایک صاحب نام و نشان کے مقابل ہو کر خود بھی نام پائیں یہ نہ سمجھے کہ مشہور نہ ہوں گے مگر اشتہاری ہو جائیں گے۔ عزت نہیں ملے گی مورد صد گونہ خواری ہو جائیں گے۔"

۲۵ر جون ۷۵ء سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران قیام مدراس میں میرزا فیروز حسین کے یہاں مشاعرہ ہوا تھا جو غالباً طلسم حیرت میں چھپی تھیں۔ سیاح کی غزل یہ ہے ؎

روکتے کس لئے ہو بزم سے ٹل جانے دو ۔۔۔ غیر کچھ جان نہیں جلد نکل جانے دو
ہم دکھائیں گے تمہیں غیر سے ملنے کا مزا ۔۔۔ چار دن اور طبیعت کو سنبھل جانے دو
عاشقو خال رخ یار کو دیکھو نہ کبھی ۔۔۔ حد سے منحوس ہے یہ دور زحل ٹلنے دو
آرزوئے دل ناشاد نکل جانے دو ۔۔۔ بس چلے آؤ کہیں آج ہی کل جانے دو
آمد فصل جنوں خیز ہے روکو نہ مجھے ۔۔۔ ہمدمو شہر سے صحرا کو نکل جانے دو
رشک سے شمع بجھے آؤ سر بزم اس طور ۔۔۔ اور پروانہ بھی جل جائے تو جل جانے دو
پاؤں کہتے ہیں چلو دشت کو آئی ہے بہار ۔۔۔ ہاتھ کہتے ہیں کہ قابو سے نکل جانے دو
دیکھیں اے ماہ جبیں کون ہو گا لب دید ۔۔۔ مہر حسن رخ پر نور کو ڈھل جانے دو
لے چلو حضرت دل مجھ کو سوئے کوچہ یار ۔۔۔ نہ کرو قول پہ واعظ کے عمل جانے دو
بات اثبات دہن میں ہے بقول شاعر ۔۔۔ گفتگو کا نہیں اب اس میں محل جانے دو
ڈھنگ آورد کا چھپتا نہیں ہرگز صاحب ۔۔۔ دل پریشاں ہے تو لکھو نہ غزل جانے دو

؎ سید محمد کا ذکر سیاح کے سفرنامے میں نہیں۔ نہ معلوم یہ کون تھے اور کس طرح ان امور کے جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے شاہد عین ہو سکتے ہیں۔ اگر سیاح کے ساتھ ایوان گاڑی میں گئے بھی ہوں تو لیڈی ہوبرٹ کے یہاں باریاب نہ ہوئے ہوں گے۔ (عبدالودود)

قدردانوں کو سنانے کو یہ اشعار ہیں بس — نہ لکھو اس سے زیادہ ہے ہزل جانے دو
کھینچو خنجر نہ کمر سے پئے قتل سیاح — دست نازک کہیں ہو جائے نہ شل جانے دو

۱۴ر جولائی ۱۸۷۵ء۔ غلام محمد خاں شبیر کا طویل اردو قصیدہ میر غلام بابا خاں اور مختصر فارسی قصیدہ سیاح کی مدح میں مؤخر الذکر کا پہلا اور آخری شعر:۔

ہست ہر اہل رصد در فکر از اجلال تو — کئے تواند ارتفاع کوکب اقبال تو
شاعری لیکن تو بیداری نزاکت در کلام — بلبلی لیکن زگلبرگ است ہر شہبال تو

۲۸ر جولائی ۱۸۷۵ء ——"اعوذ برب الاحد من شرحا سد اذا حسد" کے عنوان سے "صلح کل" کی ایک تحریر "میاں غلام (کذا) احمد محی الدین کے خلاف چھپی ہے۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ اصل جھگڑا اس کا ہے کہ سیاح نے یہ کیوں نہ بتایا کہ گورنر کے یہاں رسائی ان کی بدولت ہوئی۔ اگر ایسا تھا تو کون سی فخر کی بات ہے اور عدم اظہار سے کیا شان میں خلل پڑ گیا؟" نامہ نگار کا یہ الزام بھی ہے کہ انھوں نے وہ احسانات جو سیاح نے سورت میں ان پر کئے تھے بالکل بھلا دیئے۔ یہ عبارتیں بھی لطائف غیبی کی یاد دلاتی ہیں "گہار لڑتے ہو۔ ناحق سیاح سے جھگڑتے ہو۔ کہیں وقائع نگاروں پر منہ آتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ سیاح جہاں آشنا ہے۔ اس کا ایک ایک دوست میرا خاکہ اڑائے گا۔ حماقت و شرافت کا پردہ کھل جائے گا۔" اس تقریر کے آخر میں مدیر نے بھی چند سطریں لکھی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ سیاح کا خطاب "سیف الحق" بھی ہے اور وہ ایک ظریف زندہ دل مگر نازک مزاج آدمی ہیں۔ ان کی "لیاقت خداداد ہے"۔ "ایسی ویسی تحریروں سے ان کا کچھ نقصان نہیں ہو سکتا۔ احمد محی الدین کا مکان اگر بہت بڑا ہے تو وہ کسی کے کہنے سے جھونپڑا نہیں ہو سکتا۔" انھیں سیاح کے ظریفانہ فقروں کا برا نہ ماننا چاہیئے۔ میرا قیاس ہے کہ سید محمد اور صلح کل کے نام سے جو تحریریں چھپی ہیں ان کے لکھنے والے خود سیاح ہیں۔

ار ستمبر ۱۸۷۵ء۔ سیاح کا خط اس مضمون کا ہے کہ مدراسی اخباروں نے شرارت اور شہدپن کی انتہا کر دی ہے۔ "یہ لوگ ہرگز قابل خطاب نہیں...... مغلظات اور پھکڑ...... ان کا تعلق ہے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری رہا تو اور طرح مواخذہ کروں گا۔" مدیر نے بھی اس پر چند سطریں لکھی ہیں اور سیاح کی تہذیب و متانت کی تعریف کی ہے۔

ار ستمبر ۱۸۷۵ء ——احیاء العلوم[*] کے اردو ترجمے کا اشتہار۔ قیمت (۱۰) روپے۔

۱۳ر جنوری ۱۸۷۶ء۔ میں سیاح سے متعلق یہ خبر درج ہے کہ "دسمبر سے داد سیاحت دے رہے ہیں۔ ہنگام رونق افروزی شہزادہ کے اول بمبئی اور بعدہٗ کلکتہ کی سیر کی وہاں سے بانی پور (پٹنہ)، بنارس وغیرہ ہوتے ہوئے لکھنؤ تشریف لائے۔ یہاں تین چار روز قیام فرما کر ۱۲ر جنوری مرادآباد، رامپور کی طرف روانہ ہوئے وہاں سے دہلی کا قصد ہے۔"

۲۳ر فروری ۱۸۷۶ء میں یہ اطلاع ہے کہ سیاح لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔

۱۹ر مارچ ۱۸۷۶ء —— مدیر کی طویل تحریر بعنوان "مکرمی منشی میاں داد خاں صاحب سیاح" خلاصہ:۔

سیاح نے "بعض حصۂ ملک عجم وغیرہ کی سیاحت کی اور کئی بار ہند کے اکثر حصوں کا سفر کیا۔ ۱۸۶۱ء میں پنجاب، دہلی، لکھنؤ، کلکتہ گئے۔" اور سفر بری سے ملک دکن واپس ہوئے۔" اسی سفر میں غالب کے شاگرد ہوئے اور "منشی نولکشور سے دوستانہ تعلقات

---

[*] ۔ غلام بابا خاں سے اس کام کے لئے مالی امداد طلب کی گئی تھی۔

کی ابتدا ہوئی۔ ۱۸۶۲ء میں کشمیر جانے والے تھے مگر یہ سفر ملتوی رہا لیکن لکھنؤ اور دہلی وغیرہ جانا ہوا جس کا حال انھوں نے سیر سیاح میں لکھا ہے۔ مدراس میں لارڈ اور لیڈی ہوبرٹ نے طلائی لاکٹ دیا جس کی کیفیت "مدراس اتھینیم" وغیرہ میں شائع ہو چکی ہے۔ وہاں "شہزادہ فیروز مرزا داماد پرنس مدراس" (وارکاٹ) سے "مراسم اخلاص رہے"۔ "بعض کور باطن حاسدنے ..... مخالفت کی ..... کجا یہ پلید حاسد اور کجا (یہ) خلیق الطبع کریم الاخلاق"۔ نومبر میں "منشی صاحب" (نولکشور) "بغرض ہمراہی دورۂ شاہزادہ" بمبئی گئے تو سیاح بھی آگئے اور جب تک وہ وہاں سے رخصت نہ ہوئے ساتھ رہے۔ اس کے بعد چند ماہ کی رخصت لے کر مختلف مقامات کلکتہ، پٹنہ، بنارس، لکھنؤ، دہلی، آگرہ، جے پور میں شہزادے کے استقبال کی دھوم دھام دیکھی اور موخر الذکر مقام میں مہاراجہ سے ملاقات کی۔ وہاں سے لکھنؤ جانا ہوا اور بالآخر لکھنؤ پہنچ کر کچھ دن منشی صاحب کے مہمان رہے۔ سیاح کا "تعلق رفاقت ..... میر جعفر علی خاں بہادر مرحوم رئیس صورت (سورت) کے زمانے سے جس کو بیس پچیس برس کا عرصہ گزرا"۔ نواب میر غلام بابا خاں (داماد نواب جعفر علی خاں) "ایسے خیر خواہان ریاست کی دل سے قدر فرماتے ہیں اور آپ کے پاکیزہ خیالات کو نہایت عزیز رکھتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء میں جو حضرت سیاح نے ہندوستان کا سفر کیا تو ...... تجویز فرمائی کہ احیاء العلوم ..... اردو ...... میں ترجمہ ہو کر چھاپا جائے تو نہایت مستحسن ہے چنانچہ ..... نواب ...... سے تحریک فرمائی ...... ممدوح نے بطیب خاطر اس فیضان عام کا جاری فرمانا منظور فرمایا کامل اعانت ...... فرماکر جان اسلام پر احسان کیا۔" اس موقع پر ...... اس قدر لکھنا کافی سمجھتے ہیں کہ اس ملک ہند کے افتخار احباء کے لئے ..... خطاب خاص کا از جانب احباب ملنا ضرور ہے۔" میرا قیاس ہے کہ ترجمہ احیاء العلوم جس کی اشاعت میں نواب نے مدد دی تھی وہی ہے جس کا اشتہار ۱۸۷۵ء میں ہے اور جو مطبع نولکشور میں چھپا تھا۔

۲۶ مارچ ۱۸۶۶ء میں میر غلام بابا خاں کی مدح میں دو قصیدے شائع ہوئے ہیں جو مدیر کو سیاح سے ملے۔ پہلا اشرف علی اشرف (شاگرد نسیم دہلوی) کا ہے اور دوسرا نواب احمد حسن خاں جوشش لکھنوی کی تصنیف ہے۔ جوشش کے قصیدے میں چند شعر سیاح کی تعریف میں بھی ہیں۔ از انجملہ:۔

(۲) علی الخصوص میاں داد خاں ذی رتبہ — تخلص ان کا ہے سیاح سب پہ ہے اظہار

(۱) کیا ہے اس کو خدائے کریم نے نواب — مصاحب اس کے ہیں ہمرہ یمین و یسار

(۳) خدا نے علم سخن میں کیا ہے فردوسی — ذہین و عاقل و خوش فکر ہیں وہ نیک شعار

(۴) قصیدہ گوئی میں کس طرح میں کہوں عرفی — یہ آفتاب وہ ذرہ یہ نور اور وہ شرار

(۱) مردان علی خاں، تخلص بہ نظام و رعنا شاگرد غالب و آتش کے کلیات (طبع نولکشور) میں جس کا سال الطباع نسخۂ پیش نظر کے سرورق کے غائب ہونے کی وجہ سے معلوم نہیں لیکن جس میں ۱۲۹۲ھ تک کی کہی ہوئی تاریخ ہے۔ سیاح کی دو غزلوں کے مخمس موجود ہیں۔ غزلیں یہ ہیں۔[۵۹]

---

[۵۹] دیکھئے غزل نمبر (۴۴) اور (۶۸) ۔ (ظہیر)
اودھ اخبار میں نمبر ۴۴ کے مطلع کا اولیٰ مصرع اس طرح ہے ؎ تلاش یار میں رگڑی ہیں اس نے ایڑیاں برسوں۔
اودھ اخبار میں تیسرا شعر اس طرح ہے:۔ کہیں نافہ نظر آ جائے اس لیلیٰ شمائل کا — سرو پا ہوں (کذا) شل کر دکار واں برسوں
اودھ اخبار میں نمبر ۴۴ کا شعر نمبر (۴) نہیں ہے۔
اودھ اخبار میں نمبر ۶۸ کے صرف (۷) شعر ہیں۔ اشعار نمبر ۱-۲-۶-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵-

مسطورِ بالا کے سپردِ قلم کئے جانے کے کچھ دن بعد اودھ اخبار ۱۸۷۶ء کی جلد ملی جس کی نسبت یہ گمان تھا کہ غائب ہوگئی ہے۔

(۱) ۱۶ر جنوری۔ احیاء العلوم کے ترجمۂ اردو ۱۸۷۳ء میں غلام بابا خاں کے نام پر شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ مطبع نے موصوف کا شکریہ ادا کیا ہے جس سے صریحاً یہ مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کی اشاعت کے اخراجات کسی نہ کسی حد تک ادا کئے تھے۔

(۲) ایضاً۔ سیاح ظہیر بلگرامی کے تصانیف لکھنؤ سے سورت لے گئے تھے۔ اسرارِ غفلت مصنفہ ظہیر غلام بابا خاں کے حکم سے نولکشور نے چھاپی تھی۔

(۳) ۲۴ر مارچ۔ سیاح کی مدح میں احمد حسن خاں جوش کی مختصر مثنوی جو صنعت توشیع میں ہے۔ تمہید میں حرف شناسے سیاح کا ذکر ہے۔ اس کے کچھ اشعار میں غلام بابا خاں کی مدح معلوم ہوتی ہے۔

(۴) ۵ر مئی۔ آغا علی شمس[۶۰] کی مثنوی بمدح سیاح۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاح نے ایک "چادر بانات" شمس کو بھیجی تھی۔

(۵) ۱۳ر اکتوبر۔ "افیون کی مدح و قدح[۶۱]" مجھو شاعر کی ایک مثنوی جو سیاح نے اشاعت کے لئے بھیجی تھی۔

---

۶۰ سیاح کے کاغذات میں آغا علی شمس کا ایک فارسی خط محفوظ ہے۔ اس کا مضمون سیاح کی مدح سرائی سے تعلق رکھتا ہے۔

۶۱ مجھو نے اپنے آقائے ولی نعمت نواب حسین یاور خاں والئی ریاست کھمبایت کی خوشنودی کے لئے یہ مثنوی لکھی تھی۔ نواب موصوف اتیون کے عادی تھے۔ ان کے شاگرد محمد منظور نے اس کی مذمت میں ایک مختصر مثنوی لکھ ڈالی۔ یہ دونوں مثنویاں بمبئی کے مطبع حیدری سے میں شائع ہو چکی ہیں۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے راقم کا مضمون "گجرات کی مثنویاں"۔ (ظہیر)

کلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

در نفی اثبات

۱ پتہ کس کو ملا ہے تیری شانِ کبریائی کا / عبث کرتے ہیں ہم شکوہ خرد کی نارسائی کا

نظر میں جس کے ایک جلوہ ہو تیری کبریائی کا / وہ قابل کس طرح ہو اور کی جھوٹی خدائی کا

قدم رکھے تری راہِ محبت میں اگر کوئی / تو لائق ہے کہ دعویٰ ہو خضر کی رہ نمائی کا

شہیدوں کو ترے دیکھیں تو پھر کیوں کر رہے باقی / بتانِ خوبرو کو ناز اس گلگوں قبائی کا

رہے گردن جھکائے عمر بھر تیرے تصور میں / کسی کو تیرے در پر قصد اگر ہو جبہہ سائی کا

جمالِ شاہدِ مطلق کا دیکھا پرتو دل میں / اڑایا دل سے انداز آئینہ نے بھی صفائی کا

پھنسائے گر بلا میں تو تجھی کو پھر پکاریں ہم / کسے آتا ہے یہ شیوہ جہاں میں دلربائی کا

برائی اور بھلائی جب تجھی پر چھوڑ دی ہم نے / تو کچھ نقصاں ضلالت کا نہ حاصل پارسائی کا

اسی پر تیری رحمت ہو کہ جو مظلوم ان کا ہو / بجا ہے ان بتوں سے شکوہ کرنا بیوفائی کا

وہ خالق ہے ثنا اپنی بھی کرنی حمد ہے اس کی / کوئی مورد نہیں دنیا میں عیب خودستائی کا

نظر آتا ہے سب کو اور ہی سب چیز میں جلوہ / اسی کے واسطے زیبا ہے دعویٰ خودنمائی کا

بہت سی ٹھوکریں اے خضر کھائیں راہ میں اس کی / پھر اس پہ آپ کو دعویٰ ہے اپنی خودنمائی کا

سخندانی بھی کام آئی نہ اے سیاح یاں اپنی
دگرنہ شاعری میں بول بولیں ہم خدائی کا

۲ دریوزہ گر نہیں ہوں کسی کی جناب کا / ساجد ہوں آستانِ رسالت مآب کا

اس پر کبھی نہ رحمتِ پروردگار ہو / مورد بنے اگر کوئی تیرے عتاب کا

یثرب کے شوق میں ہے تڑپنے دے چارہ گر / کرتا ہے کیوں علاج مرے اضطراب کا

دشمن کو ڈر ہے زخم پہ انگور آ نہ جائے / ثابت ہے جبکہ تاک سے پینا شراب کا

آنسو گرائے یاد میں اس کی اگر تو پھر / کوثر سے رتبہ کم نہیں چشمِ پُر آب کا

رونق ہے سب یہ دی ہوئی تیرے ظہور کی / کچھ بن گیا ہے رنگ جہانِ خراب کا

ہم اس کے ہیں، کہیں گے نکیریں سے یہی
مرکر کسے دماغ سوال و جواب کا

جب دل سے پڑھ لیا کلمے کو تیرے تو پھر
ترساں گناہ سے ہوں نہ خواہاں ثواب کا

ڈر ہے بیانِ جود سے تیرے کہ شرم سے
موقوف ہو نہ جائے برسنا سحاب کا

ملتے رہے نہ کیوں کفِ افسوس عمر بھر
پہنچا نہ ہاتھ جسم پہ تیرے ثیاب کا

آفت میں اس کی مجھ کو خدا نے کیا شمار
سیاحؔ دغدغہ نہیں روزِ حساب کا

۳ تصورِ روز و شب ہے عارض و ابروئے جاناں کا
گماں طاقِ حرم پر صاف ہو جاتا ہے قرآں کا

نہ کہنا چاہیئے قرآں و طاق ان کو کسی صورت
یہ در بیت المقدس کا ہے وہ کعبہ مسلماں کا

اسے بیت المقدس اور اسے کعبہ سے کیا نسبت
یہ کنجی بابِ جنت کی ہے وہ روضہ ہے رضواں کا

کچھ اس تشبیہ سے بھی غنچۂ دل وا نہیں ہوتا
یہ شاخِ نرگسِ شہلا ہے وہ نقشہ گلستاں کا

بہت ہی نے خطا کی اوج سے آیا جو پستی پر
یہ نقشہ ہے ہلالِ عید کا وہ بدرِ تاباں کا

ہلال و بدر میں ایسی کہاں ہے روشنی تو یہ
یہ پرِ روح الامیں کا ہے وہ جلوہ نورِ عرفاں کا

نہ کہنا چاہیئے یہ بھی بہت ترکِ مراتب ہے
یہ محرابِ عبادت ہے وہ قبلہ اہلِ ایماں کا

کہاں قبلہ کہاں محراب کیا کہتا ہوں میں یارب
یہ اک شمشیرِ براں ہے وہ شعلہ برقِ سوزاں کا

نہ یہ تیغِ دو پیکر ہے نہ وہ بجلی کا شعلہ ہے
یہ ناخن زخمِ دل کا ہے وہ مرہم داغِ ہجراں کا

نہ یہ ناخن نہ وہ مرہم غلط تشبیہ ہوتی ہے
یہ جیغہ ہے سلیماں کا وہ تختہ ہے پرستاں کا

سلیماں و پرستاں کا بھلا کیا کام اس جا ہے
یہ خضرِ تشنہ لب ہے اور وہ چشمہ آبِ حیواں کا

کہاں سے بھولا کر آیا کہاں بازارِ وحشت میں
یہ آغوشِ زلیخا ہے وہ جلوہ ماہِ کنعاں کا

عجب ہے منہ سے کچھ کہتا ہوں میں اور کچھ نکلتا ہے
یہ ہے عکسِ مسی لب پہ وہ آئینہ ہے جاناں کا

مثالِ آئینہ دینا نہیں لازم کوئی صورت
یہ کشتی نوح کی ہے اور وہ لجہ ہے طوفاں کا

نہ مضمونِ مثالی بندہ سے کا بیت معانی میں
یہ مصرعہ ہے ہلالی کا وہ مطلع میرے دیواں کا

کہاں مصرع کجا مطلع یہ سب بیہودہ گوئی ہے
یہ نونِ نقشِ قرآں اور وہ سورہ ہے رحماں کا

یہ نونِ نقشِ قرآں ہے نہ وہ سورہ ہے اے سیاحؔ
یہ خنجر ہے مرے دل کا وہ شعلہ خرمنِ جاں کا

۴ ریاض دہر میں سر سبز جو نہال ہوا
خزاں کے ہاتھ سے اک روز پائمال ہوا

دمِ سخن جو دہن کا ترے خیال ہوا
زباں دہن میں رہی اور سخن محال ہوا

مرا لہو کفِ گلگوں پہ جو بحال ہوا
وہ گل خوشی میں یہ پھولا کہ رنگ لال ہوا

غبار اوڑا جو سر کوئے زلفِ مشکیں سے
عبیرِ دامنِ نظارۂ جمال ہوا

بندھا خیال جو محفل میں چشمِ وحشی کا
ہر ایک ساغرِ مے دیدۂ غزال ہوا

مری شبیہ سے رعشہ پڑا جو ہاتھوں میں
قلم کا تھامنا بہزاد کو محال ہوا

ہلا نہ عید کو آکر گلے وہ مہ پارہ
جگر خراش مرا ناخن ہلال ہوا

شمیم طرہ مشکیں و تاب عارض سے
کبھی فراق رہا اور کبھی وصال ہوا

بہار صانع تقدیر کی ہے نیرنگی
گرا جو خاک پہ دانہ یہاں نہال ہوا

خیال زلف میں دم رات بھر الجھتا ہے
ہر ایک بال بدن پر مرے وبال ہوا

نکل ہی جائے گی بالے سے کان کی مچھلی
اگر نہ کاکل پیچاں یار جال ہوا

وہ چاند رات کو آکر گلے لگا میرے
کلید قفل امل ناخن ہلال ہوا

رہا نہ گلشن راحت کا ایک گل سیاحؔ
بچا جو ہاتھ سے گلچیں کے پائمال ہوا

۵ کبھی ادھر جو سگ کوئے یار آنکلا
گمان ہوا میرے ویرانہ میں ہما نکلا

رخ اس کا دیکھ ہوا زرد نیّر اعظم
سنہرے برج سے جس دم وہ مہ لقا نکلا

وہ سن کے پاک محبت کا نام کہتے ہیں
ہماری جان کو تو یہ بھی پار سا نکلا

ہمارے پاؤں پڑے آکے آبلے ہر گام
کبھی جو دشت جنوں میں برہنہ پا نکلا

مہ صیام میں آیا جو وہ ہلال ابرو
گمان ہوا یہ مجھے چاند عید کا نکلا

جہاں کی سیر تو کی تو نے لیکن اے شہ حسن
کبھی فقیر کے تکئے پہ تو نہ آ نکلا

نہ نکلا وہم کے مارے وہ گھر سے بھی سیاحؔ
گلی سے یار کے تابوت جب مرا نکلا

۶ ہر جگہ چرچا ہے تیغ ابروے خمدار کا
روم سے تا شام شہرہ ہے تری تلوار کا

یار ترچھا پن نکالو ابروے خمدار کا
بل کا پڑ جانا نہایت عیب ہے تلوار کا

گل نیا پھولا ہے عشق ابروے خمدار کا
دیکھتے ہی دیکھتے پھل لگ گیا تلوار کا

آبرو جس کو خدا دے اس میں کیا شکوہ کریں
کاٹتا ہے ہاتھ ہوتا نام ہے تلوار کا

عکس سنبل پر پڑا ہے؟ کا یہ پیچ ہے
گل پہ سایہ پڑ گیا ہے آپ کے رخسار کا

یار کی نازک مزاجی کا ہے یہ بل سیاحؔ سے
زلف چھو لیتا جو ڈر ہوتا نہ مجھ کو یار کا

۷ جبکہ طوفاں زا ہمارے اشک کا جیحوں ہوا
مثل کشتی شکستہ دیکھتا گردوں ہوا

جب سے اس کی نرگس میگوں پہ دل مفتوں ہوا
تن پہ ہر داغ جنوں جام مے گلگوں ہوا

میں بھی سمجھوں گا مری مٹی ٹھکانے سے لگی
لاشہ میرا کوئے قاتل میں اگر مدفوں ہوا

مثل شبنم رات بھر رو یا کیا سن سن کے میں
جس جگہ اس گل کا ذکر جنوں روز افزوں ہوا

بتکدوں میں ٹھوکریں کھاتے پڑے پھرتے ہیں ہم
کس بت ہرجائی پہ میرا یہ دل مفتوں ہوا

تنگدستی سے سبکساری سرائے دہر میں — زیر بار آخر کو جمع مال سے قاروں ہوا
جان کر زاہد گلاب اس کو لگا پڑھنے درود — مے کشو شکر خدا دور مئے گلگوں ہوا

جیتے جی سیاح کے دل نے نہیں پائی نجات
کیا بری ساعت اسیر گیسوئے شبگوں ہوا

۸ کل کچھ تھا آج اور ہے نقشہ جہان کا — ہر روز اک بدلتا ہے رنگ آسمان کا
پیوند خاک رستم و سہراب ہو گئے — چلتا اجل سے زور ہے کس پہلوان کا
نالہ ہمارا نغمۂ صرصر ہے عندلیب — پردہ نہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کیوں گل کے کان کا
رویا جو میں تو خار مژہ یوں ہرے ہوئے — بارش سے جس طرح ہو ہرا کھیت دھان کا
سنتا نہیں وہ نالۂ بلبل کو اے صبا — تو گل سے کہہ کہ میل نکلوائے کان کا
افسانۂ فراق سنو تو بیاں کروں — گر شوق ہے کمال تمہیں داستان کا
اعمیٰ اٹھوں لحد سے یہ میری ہے آرزو — دیکھوں نہ صبح حشر کو منہ آسمان کا
خم کس کے بار عشق سے اس کی کمر ہوئی — عاشق ہے چرخ پر یہ کس نوجوان کا
کس منہ سے بوسہ مانگئے اس سے ہے جائے شرم — جو آج تک نہیں مرا شرمندہ پان کا

در سے یوں نہ اٹھاؤ اسے پھر نہ آئے گا
سیاح آدمی ہے بڑی آن تان کا

۹ میں ہی گریاں نہیں کچھ جب سے ہے وہ یار جدا — روتے ہیں اپنے نصیبوں کو بھی اغیار جدا
دوں دعا حلق بریدہ سے تجھے اے قاتل — کر چکے تن سے کہیں سر تری تلوار جدا
بس کہ تھا دست جنوں جامہ دری میں مشغول — آبلے پاؤں پڑے پر نہ کئے خار جدا
بیٹھا ہے جوڑے ہوئے تیر نگہہ کو قاتل — ہے کھنچا نیمچۂ ابروئے خم دار جدا
وہ قبا داغوں کی پہنا تن عریاں میں جنوں — صورت پوست جو تن سے نہ ہو زنہار جدا
پتلیاں دیدۂ اختر کی طرح سے ہیں سفید — جیسے ہیں آنکھوں سے وہ چاند سے رخسار جدا
موز بک بک کے مرا کھا گیا ہر مرغ چمن — کیجئے تیز چھری سے سر منقار جدا
جنبش ابرو کو ہے یہ ہم حرثۂ قاتل ہے — تیر پڑتے ہیں جدا چلتی ہے تلوار جدا

فائدہ ایسی ملاقات سے باز آ سیاح
توڑ کے آپ کو ہو دل میں خفا یار جدا

۱۰ اپنے ہی دم سے ہے چرچا کفر اور اسلام کا — گاہ عابد ہوں خدا کا گہ پجاری رام کا
لوٹتے ہیں جس کو سن کر ہزاروں مرغ دل — ہو رہا ہے ذکر کس کے گیسوؤں کے دام کا
چشم مست یار کا ہم چشم لو پیدا ہوا — دیکھنا اب پوست کھینچا جائے گا بادام کا
سیر کرتا ہے دو عالم کی بیک نگاہ — لاکھ ہے بے دست و پا لیکن ہے پھر سو کام کا

سر جدا تن سے کیا ایک ہاتھ میں جلاد نے
نقد جاں دیجیے کیا اس نے یہ کام انعام کا

ہیں شہ ملک جنوں صحرا ہے اپنا تخت گاہ
تن پہ ہر داغ جنوں سکہ ہے اپنے نام کا

جلد نام اپنا بتا دے جیسے بندہ ہوں ترا
واسطہ دیتا ہوں میں اے بت خدا کے نام کا

بت پرستی کی بہت سیاح اب کر یاد حق
شغل مولا میں رہے بندہ وہی ہے کام کا

۱۱ دم بخود بس رہ گیا جس نے سنا مفتوں ہوا
بولنا ہکلا کے تیرا اے پری افسوں ہوا

اس قدر آنکھیں غزالوں نے ملیں جو دیکھ کر
بولی لیلیٰ دستہ نرگس تن مجنوں ہوا

خود نمائی نے کیا پابند حیرت یار کو
دیکھ کر آئینہ اپنا آپ وہ مفتوں ہوا

سرو کا مصرعہ تھا بے معنی و ناموزوں تمام
سمجھی تب قمری مقابل جب قد موزوں ہوا

نجد کے صحرا میں رعب حسن لیلیٰ دیکھ کر
بید مجنوں کی طرح لرزاں تن مجنوں ہوا

اس دہن کا جب خیال آیا دم فکر سخن
تازہ مضموں ہے کہ عنقا طائر مضموں ہوا

نشۂ افیون سے یاد خال مشکیں کم نہ تھے
چشم مے گوں کے تصور سے سرور افزوں ہوا

گلرخوں کی چشم میگوں کا تصور ہے مدام
شیشۂ دل اپنا مینائے مے گلگوں ہوا

قید غم سے دی رہائی آن کر سیاح کو
اے اجل احساں کیا تو نے ترا ممنوں ہوا

۱۲ جب سے دیکھا ہے بنا گوش قمر میں تنکا
پھانس کی طرح کھٹکتا ہے جگر میں تنکا

نیزہ بازی پہ ہمیں اپنی نہ دھمکا اے ترک
ہم سمجھتے ہیں اسے اپنی نظر میں تنکا

آتش نالۂ بلبل یہ چمن میں بھڑکی
نہ بچا نام کو صیاد کے گھر میں تنکا

خار مژگاں کو نظر بھر کے نہ دیکھا میں نے
پڑ گیا اڑ کے مرے دیدہ تر میں تنکا

سن کے آمد تری آنکھوں سے اٹھا لیتے ہیں
دیکھتے ہیں جو پڑا راہ گزر میں تنکا

گرد اس بحر صفا کے میں پھرا کرتا ہوں
رہتا ہے گردش میں جس طرح بھنور میں تنکا

آہ سوزاں نے جلائے ترے جنگل سیاح
نام کو بھی نہ رہا ایک شجر میں تنکا

بخت یاور ہے چمکتا ہے ستارا اپنا
ماہرو ایک ہے محبوب دل آرا اپنا

اس پریزاد کو دیکھا جو بدلتے پوشاک
پوست تن سے دل وحشی نے اتارا اپنا

کھولنا تھا کسی عاشق کا صنم عقدۂ دل
لطف کیا طرۂ گیسو جو سنوارا اپنا

عمر روتے ہی کٹی ہجر میں ایک مہرو کے
برج آبی میں ہے مدت سے ستارا اپنا

صفت روح نہ آئیگا تن زار نظر
کیجے آئینہ میں خاک اکارا اپنا

اٹھ گیا پہلو سے وہ ماہ لقا آخر شب
دشمن جان ہوا صبح کا تارا اپنا

منعمو فقر کی دولت سے غنی دل ہوں میں — خرچ اوقات توکل پہ ہے سارا اپنا
ملک ہستی سے میں اک دم میں عدم میں پہنچوں — توسن عمر رواں لے جو طرارا اپنا
اک جہاں حضرت غالب کا ہے شاگرد مطیع — جانتے اس کو مسیحا ہیں نصارا اپنا
ہے تلمذ اسد اللہ سے ہم کو سیاح
شاعروں میں ہو نہ کیوں فخر مدارا اپنا

۱۴ آئے قفس میں جب سے کہیں تم سا یار کیا — سب ہم کو ایک سا ہے خزاں کیا بہار کیا
بگڑے ہوئے پہ لاکھ ادائیں نثار ہیں — اچھوں کو چاہئے ہے بناؤ اور سنگار کیا
رنگت ہے زرد خشک ہیں لب اور چشم تر — تم بھی کسی کو کرنے لگے ہو پیار کیا
کہتا ہے تو یہ سب مری تسکیں کے واسطے — قاصد زبانی بات کا ہے اعتبار کیا
دیتا نہ صاف صاف مجھے تم جواب وصل — مایوس پھر کے جائے یہ امیدوار کیا
فرقت میں سخت جانی سے اپنی یہ بچ گیا — آئے تمہارے سامنے یہ شرمسار کیا
اچھا ہوا جو گھل گئیں فرقت میں استخواں — جب ہڈیاں نہ ہوں گی تو ہوگا فشار کیا
ناحق علاج کرتا ہے میرا تو اے مسیح — جائے گا زندگی میں بھلا یہ بخار کیا
قسمت سے ہے میری یار سے سیاح پھر گئی
کرتا ہے گردشیں فلک بے مدار کیا

۱۵ رخ پہ دولہا نے عجب نور کا باندھا سہرا — طرۂ مہر درخشاں پہ ہے طرہ سہرا
روز شادی کا ہے نواب کی ہے بسم اللہ — کیوں مزین نہ بھلا سر پہ ہو شملا سہرا
حور فردوس میں گاتی ہے پرستاں میں پری — اے شہ حسن بڑے لطف سے تیرا سہرا
ہیں لڑیں شمس و قمر پھول ہیں انجم سارے — نور کا ہے رخ روشن پہ نرالا سہرا
کیوں نہ ہو چرخ چہارم پہ مزاج نوشاہ — گوندھ کے دور سے لائے ہیں مسیحا سہرا
عندلیبوں کے دل زار ہیں پھولوں کی جگہ — باغباں تو نے عجب رنگ سے گوندھا سہرا
گرد شمع رخ پہ نور رہا کرتا ہے — شکل پروانہ ہے کیا والا و شیدا سہرا
طرہ پہ عقد ثریا کا گماں ہوتا ہے — ماہ رخسارۂ پر نور ہے ہالا سہرا
ہے گہر بیش بہا پھولوں میں جنت کی ہے بو — قیمت ہر دو جہاں سے ہے زیادہ سہرا
کس قدر رشک ہر ایک طالب دیدار سے ہے — دیکھنے ہی نہیں دیتا رخ زیبا سہرا
ہیں وہ لڑیوں میں گل نرگس شہلائے بہشت — آنکھیں حوروں کی کھلیں دیکھیں جو تیرا سہرا
چشم بدبیں کی نظر سے ہے بچانا منظور — بن گیا عارض پر نور کا پردا سہرا
ہو مبارک مرے نوشہ کو ہمیشہ سیاح
چمن آرائے جہاں گوندھ کے لایا سہرا

۱۶

ہوا ہے کس قدر مشہور بسم اللہ کا سہرا
کہ گاتی ہیں جہاں میں حور بسم اللہ کا سہرا

شعاعِ شمس جس کے تار ہیں اور پھول تارے ہیں
وہ ہے زیب رخ پر نور بسم اللہ کا سہرا

چمن آرائے عالم نے جو اپنے ہاتھ سے گوندھا
بنا رشک نہال طور بسم اللہ کا سہرا

سنگھا کر اپنے پھولوں کی مہک عالم سے کھوئے گا
شمیم عنبر کافور بسم اللہ کا سہرا

انا الحق پھر نہ کہتے یاد کرتے اس کے شعروں کا
جو سنتے حضرت منصور بسم اللہ کا سہرا

لپک آتا ہے دامن تک کہ پابوسی کرے حاصل
نہیں پاتا مگر مقدور بسم اللہ کا سہرا

چمک مقیش کے تاروں میں ہے برق تجلی کی
دکھاتا ہے فروغ طور بسم اللہ کا سہرا

نہ دیکھے اس کے پھولوں کو نگہ بھر کر کبھی نرگس
رہے اب چشم بد سے دور بسم اللہ کا سہرا

نگاہ کم سے بجلی پر نظر کرتے ہیں تار اس کے
ترے سر چڑھ کے ہے مغرور بسم اللہ کا سہرا

ہوا ہے قاف سے تا قاف شہرا اس کا جو سیاحؔ
پری گائے نہیں کچھ دور بسم اللہ کا سہرا

۱۷

تم کو نوشاہ مبارک ہو یہ سر پہ سہرا
آج اس بزم میں بھی آپ کے ہے سر سہرا

جس طرح ماہ کو خورشید سے ہے کسب ضیا
اس طرح آپ کے رخ سے ہے منور سہرا

انجمن صورت انجم ہے مکاں چرخ بریں
کیوں نہ ہو عقد ثریا کے برابر سہرا

نکہت گل سے بسی محفل جشن شادی
کیا ہی گلچیں نے یہ گوندھا ہے معطر سہرا

مصحف سادہ پہ تفسیر ہو جس صورت
چہرہ سہرے کا ہوا چہرے کا زیور سہرا

آپ سرتاج ہیں امت کے تعجب کیا ہے
کنگنہ جبریل امیں باندھیں پیمبر سہرا

عمل سنت آدم جو مسلمانی ہے
لائے ہیں حضرت الیاس بنا کر سہرا

مہر تاباں کو چھپائیں نہ کبھی تار شعاع
کیونکہ ہو جائے حجاب رخ انور سہرا

شور تحسین ہوا بزم میں کیا اے سیاحؔ
نذر نواب کو لایا ہے تو کہہ کر سہرا

باب ب

۱۸

نکلا نہ ایک روز بھی ارمان عندلیب
کیا کیا تڑپ تڑپ کے گئی جان عندلیب

کانٹوں سے ہے بھرا ہوا دامان عندلیب
پرزے ہے مثل گل کے گریبان عندلیب

آئی جو بوئے گل کبھی کنج قفس تلک
پرواز تن سے کرنے لگی جان عندلیب

نالہ لبوں پہ سوز جگر چشم خونچکاں
کیا کیا ہوائے گل میں ہے سامان عندلیب

پونچھے جگر کے زخم کو یا دل کے درد کو
ہے کس کو درد سر پئے درمان عندلیب

خار فنا سے گل کا گریباں ہے چاک چاک
ماتم سرا ہوا ہے گلستان عندلیب

باد صبا سے مصحف گل کے ورق کھلے
صحن چمن ہوا ہے دبستان عندلیب

ہنستے ہیں گل اسیری سیاحؔ پر ابھی تو
غنچے ہیں قفل خانۂ زندان عندلیب

باب ت ۱۹

چمن میں دیکھ کر اس غیرت گلزار کی صورت
رگ بلبل کھٹکتی ہے بدن میں خار کی صورت
جو دیکھے آنکھ اٹھا کر اس گل بیمار کی صورت
عصا کو ٹیک کے نرگس اٹھے بیمار کی صورت
مجھے باتوں ہی باتوں میں ستم گر قتل کرتا ہے
دم گفتار چلتی ہے زباں تلوار کی صورت
جو لے وہ غنچہ لب ہاتھوں سے تیرے کام نالوں کا
بنی ہے باغباں قینچی تری منقار کی صورت
ملی ہے کشتۂ چشم بتاں کی خاک کیا اس میں
بگولہ لڑکھڑاتا جو اٹھا بیمار کی صورت
تصور اس بت کافر کی زلفوں کا نہیں جاتا
گلے پڑتی ہے یہ ناگن مرے زنار کی صورت
اٹھا کر آنکھ اس ظالم کو دیکھا جس نے کوٹھے پر
جگہ سے اپنے ہل سکتا نہیں دیوار کی صورت
پیاسا ہے دل بیتاب اس کے آب پیکاں کا
ہر اک زخم بدن کھولے ہے منہ سوفار کی صورت
یہاں تک چھپ کر بہتا ہے دریا میرے آنسو کا
نظر آتی نہیں اس پار سے اس پار کی صورت
فراق بزم جاناں سے ہزاروں نالے کرتا ہوں
تن صد چاک سے پیدا ہے موسیقار کی صورت
جسے میں دیکھتا ہوں در پہ تیرے سجدہ کرتا ہے
نظر آتی ہے یکساں کافر و دیندار کی صورت
لیا بوسہ جو ابرو کا تو کیا کیا غیض میں آ کر
کبھی دیکھی مری صورت کبھی تلوار کی صورت
وہ مرغ نیم جاں ہوں گر زباں ہو بند نالوں سے
مرے نالوں کا کانٹا دے صدا منقار کی صورت
پھنسا زاہد کا دل جو اس بت کافر کی زلفوں میں
رگیں گردن کی کھنچ کر بن گئیں زنار کی صورت
پھری آنکھ اس مسیحا کی جو مجھ سے ان دنوں صاحب
پڑا رہتا ہوں بند آنکھیں کئے بیمار کی صورت

گرے ہر گام پہ مانند متوالوں کے ہم سیاح
بڑی مشکل سے دیکھی خانۂ خمار کی صورت

باب ج ۲۰

منعم نہیں جو ہو کلۂ زر کی احتیاج
ہوں دل کا بادشاہ نہیں افسر کی احتیاج
غفلت سرائے دہر میں خانہ بدوش ہوں
کس زندگی کے واسطے ہو گھر کی احتیاج
قاتل کی تیغ قتل کی میرے گواہ ہے
دعویٰ ہیں اپنے کیا مجھے محضر کی احتیاج
وہ تند مئے پلا کہ کلیجہ کباب ہو
ساقی ہے ایک اور بھی ساغر کی احتیاج
مسند ہے سطح خاک میری وہ گدا ہوں میں
بالش کی آرزو ہے نہ بستر کی احتیاج
ہرگز بنا نہ آئینہ دل سے صاف تر
نکلے نہ آئینہ سے سکندر کی احتیاج
جائے گا اڑ کے طائر دل میرا یار تک
حاجت نہ نامہ کی نہ کبوتر کی احتیاج
چھوتا ہوں اس کی میں عرق آلودہ زلف کو
پانی کے سانپ کو نہیں منتر کی احتیاج
اڑ جائے گا نہ ہوگا یہ پابند قید زلف
صیاد مرغ دل کو نہیں پر کی احتیاج

سیاح گو فقیر ہے پر دل کا ہے غنی
رکھتا نہیں ہے فرش مشجر کی احتیاج

باب چ ۲۱

بلبل نے پہلے گل سے کیا اختیار کوچ
کرنے لگی چمن سے جو فصل بہار کوچ

آئینہ ساز دیکھ کے گیسوے یار کو
ملک حلب سے کر گئے سوئے تتار کوچ

ہمراہ لے کے جائیں گے بوتل شراب کی
سوئے عدم کریں گے جو ہم بادہ خوار کوچ

جنبش میں آسماں ہے زمیں کانپنے لگی
کس بے قرار کا ہے بسوی مزار کوچ

ہے قیس نیم جاں ترے ناقہ کے ساتھ ساتھ
کیجو سمجھ کے لیلیٰ محمل سوار کوچ

رہتا نہیں ہے دورِ چمن ایک رنگ پر
آئی خزاں تو کر گئی فصل بہار کوچ

جور و ستم بتوں کے اگر ہیں اسی طرح
کرتا ہے آج کل ہی میں جاں نثار کوچ

خانہ بدوش پھرتے ہیں جن کی تلاش میں
ان کا پتہ نہیں ہے گئے ہیں ہزار کوچ

لازم ہے کچھ تو نام کی بھی اپنے پیروی
اس کے لئے تو کرتے ہیں ہم بار بار کوچ

جی بھر کے دوستوں سے گلے بھی نہ مل سکا
کیا جلد قافلہ نے کیا ایک بار کوچ

نے زاد ہے نہ راحلہ ہے نہ کوئی رفیق
کیوں کر کروں جہان سے پروردگار کوچ

جا کر عدم میں بیٹھ رہوں گا میں چین سے
دنیا میں رہ کے کون کرے بار بار کوچ

پابند ایک شہر میں ہرگز نہ ہو دلا
دس بیس ہوں مقام تو دو تین چار کوچ

آئے تھے لکھنؤ میں بڑے اشتیاق سے
دیکھا نہ کچھ تو ہم نے کیا ایک بار کوچ

عاشق تو تین دن نہیں رہتا کسی طرح
سیاحؔ لکھنؤ سے بھی کرتا ہے یار کوچ

باب ح ۲۲

دیکھ لی گلزار میں رنگیں جو اس گل کی طرح
سینۂ گل چاک ہے منقار بلبل کی طرح

سرخ ہے چہرہ گلوں کا ساغر مل کی طرح
ساغر مل زر فشاں ہے چہرۂ گل کی طرح

ابر کی گوہر فشانی سے حسینانِ چمن
تکیہ زن شاخوں پہ ہیں اہلِ تمول کی طرح

ہے ہوائے میکشی سے غنچۂ دل باغ باغ
قلقل مینائے ساقی خندۂ گل کی طرح

چہرۂ گل سے ہے دریائے لطافت جوش پر
ہے کمند موج پیچاں زلف سنبل کی طرح

رازِ دل اپنا چھپاتا ہوں جو بزم یار میں
شور قم قم کا بپا ہوتا ہے قلقل کی طرح

نافۂ آہو اگر اس کو کہیں تو ہے خطا
مشک و عنبر میں نہیں بو تیرے کاکل کی طرح

بے خودی دل کی ہماری قتل کرتی ہے ہمیں
اس بت سفاک کی تیغ تغافل کی طرح

کون سی خوبی کو میں اس شوخ کی ترجیح دوں
ہے تجمل حسن کا حسنِ تجمل کی طرح

یا الٰہی جس قدر تو حسن پر مغرور ہے
تیرے عارض میں شکن پڑ جائے کاکل کی طرح

دیکھ کر طرح غزل کہتا ہے وہ نازک مزاج
کیا چہکتا ہے تو اے سیاحؔ بلبل کی طرح

۲۳ ہر ایک داغ سے روشن ہے دل قمر کی طرح
ملا ہے عیب کو مرے شرف ہنر کی طرح

نہیں ہے خانہ دل خانہ بشر کی طرح
سنبھل کے بیٹھیے صاحب نہ اپنے گھر کی طرح

الٰہی ہم سے معمہ یہ کھل نہیں سکتا
دہن بھی ہو گیا معدوم کیا کمر کی طرح

کسی کا سنگِ شماتت اٹھا نہیں سکتے
گرہ میں رکھتے ہیں ہم آبرو گہر کی طرح

خدا نے عشق میں ثابت قدم رکھا ہم کو
اٹھے نہ منزلِ جاناں سے سنگِ در کی طرح

چمن میں پھوٹ کے جو آبشار روتا ہے
یہ کس کے دید کا طالب ہے چشمِ تر کی طرح

تصور آنکھ میں ہے اس کے روئے روشن کا
مگر نظر نہیں آتا کبھی نظر کی طرح

ہوائے گلشن کوئے نگار آتی ہے
گرے ہیں شاخ سے گل ٹوٹ کر ثمر کی طرح

محیطِ عشق سے یہ آبرو ملی سیاح
کہ تہ کو بیٹھ گئے جا کے ہم گہر کی طرح

۲۴ نظر نہ آیا کبھی وہ ہمیں نظر کی طرح
ہمیشہ چشم ہے وا حلقہ ہائے در کی طرح

دیا جواب نہ خط کا نہ کچھ خبر آئی
الٰہی گم ہوا کیا نامہ بر خبر کی طرح

عدم سے آتے ہی ہوتی ہیں حسرتیں موجود
انگوٹھے چوستے ہیں طفلِ نیشکر کی طرح

ہر ایک بات پہ شر ہے دلیلِ حیوانی
بشر وہی ہے کہ پیش آئے جو بشر کی طرح

رہی نہ طاقتِ پرواز ناتوانی سے
اڑاتے پھرتے ہیں لڑکے گلی میں پر کی طرح

نہیں ہے سیم دلوں میں عیارِ حسن وفا
کسا بہت محکِ امتحاں پہ زر کی طرح

شعاعِ چہرہ سے بخیہ کی مجھ کو خواہش ہے
ازل سے چاک گریباں ہوں میں سحر کی طرح

سببِ وصال جو مرغِ سحر نے دی آواز
جگر پہ موگری پڑنے لگی گجر کی طرح

ہماری آہ سے آندھی اٹھی جو گلشن میں
ہر ایک نخل گرے ٹوٹ کر ثمر کی طرح

تمہارے حال پہ سیاح اشک جاری ہیں
کبود جامۂ مردم ہے نیلوفر کی طرح

۲۵ ہے شاد شاد مقدمِ جاناں سے تن میں روح
آتے ہی اس کے جا کے پھر آئی بدن میں روح

صیاد میں وہ بلبلِ صحرا نورد ہوں
جائے گی اڑ کے کنجِ قفس سے چمن میں روح

شانہ سمجھ کے گیسوئے پیچاں میں کیجئے
عشاق کی ہے الجھی ہوئی ہر شکن میں روح

بن کر بگولا محملِ لیلیٰ کو آج تک
پھرتی ہے ڈھونڈھتی ہوئی مجنوں کے تن میں روح

وحشت تو ہم کو وادیٔ غربت میں لے چلی
جاتا ہوں لو میں چھوڑ کے اپنے وطن میں روح

للہ اب تو چاند سی صورت دکھائیے
مثلِ چراغِ صبح کوئی دم ہے تن میں روح

جیسے گلوں کے عشق میں گل کھا کے مر گئے
بلبل کے ساتھ نغمہ سرا ہے چمن میں روح

جاتی ہے جان تجھ پہ حسینوں کی اے پری
یوسف کی طرح گرتی ہے چاہِ ذقن میں روح

رشکِ شمیمِ گیسوئے مشکینِ یار سے
باقی رہی نہ نافۂ مشکِ ختن میں روح

ایک شمع رُو کے عشق میں جل کر فنا ہوئی
پروانہ بن کے پھرتی تھی ہر انجمن میں روح

ملتا نہیں نشاں تن لاغر کا زیر خاک
پھرتی ہے ڈھونڈتی ہوئی لاشہ کفن میں روح

الجھی تھی زلف یار پاؤں پہ جان دی
قالب خفن میں رہ گیا پہونچی یمن میں روح

پتھر میں ایسی بات کہاں سے ہوئی نصیب
کس رنگ سے گئی لب لعل یمن میں روح

یہ کجروی چرخ نے ڈالا ہے تفرقہ
ہم لکھنؤ میں پھرتے ہیں اور ہے وطن میں روح

آیا نہ یار وعدہ پہ سیاح صبح تک
کیا کیا شب فراق میں تڑپی بدن میں روح

باب د

گو محبس دنیا میں ہیں سب ناکس و کس بند
لیکن نہیں ہوتا ہے در حرص و ہوس بند

۲۶ مجنوں ہے نہ لیلی ہے نہ ناقہ ہے نہ محمل
ہے نجد کے صحرا سے بھی آواز جرس بند

ناکام ہیں اس عصر میں سب طالب دنیا
گو ظرف میں شیرینی کے ہیں مثل مگس بند

ہوتی کبھی گلزار میں یہ زمزمہ پیرا
ناحق کیا صیاد نے بلبل کو قفس بند

رک سکتا ہے پلکوں سے کہیں اشک کا دریا
کب آمد سیلاب کو کر سکتا ہے خس بند

ہے محبس دنیا میں غضب قید تعلق
گر ایک ہوا اس میں رہا تو ہوئے دس بند

یوں قید میں ڈالا ہے مجھے اہل وطن نے
زندان میں مجرم کو کرے جیسے عسس بند

بلبل کے لئے نکہت گل آئے گی صیاد
اس فصل میں للہ نہ کر باب قفس بند

کہدو کہ یہاں دختر رز پردہ نشیں ہے
میخانہ کا دروازہ کریں پھر نہ عسس بند

واعظ کو بجز ذکر لحد کچھ نہیں آتا
کرد و اسے ایک حجرۂ تاریک میں بس بند

رتبہ عرفاں نہیں سیاح طلب اور
سب روئے خلائق پہ کئے باب ہوس بند

۲۷ کیا عجب گر ہو گئی رونے سے چشم تر سفید
ابر کالے بعد بارش ہوتے ہیں اکثر سفید

عاشق دیوانہ ہوں ایک شوخ سیم اندام کا
نقرئی بیڑی بنا دے مجھ کو اے زرگر سفید

چاندنی چمکی چڑھا گھوڑے پہ جب وہ ماہ رو
چادر مہتاب کی صورت ہوئی پاکھر سفید

سرخی پان اس لب نازک پہ جب آئی نظر
رنگ مرجان کا اڑا ہے صورت گوہر سفید

عمر خضر اس کو ملے طالع رہے صبح امید
اے خدا اس سیم تن کے ہوئیں موئے سر سفید

آپ کے صدقے سے ہوئی اس سیہ روز کی نجات
نامۂ اعمال ہو اے شافع محشر سفید

زلف میں بالوں کے موتی دیکھ کر دھوکا ہوا
چشمۂ ظلمت سے نکلے ہیں یہ دو گوہر سفید

آئینہ حیراں ہوا اس کی صباحت دیکھ کر
اس قدر ہے عارض شفاف سیمین بر سفید

زلف کی کیونکر سیاہی شست و شو سے جائے گی
لاکھ تدبیریں کرو ہوتا نہیں عنبر سفید

خشک تھا یہ ناتوانی سے لہو اس جسم کا
ذبح قاتل کر چکا لیکن رہا خنجر سفید

حال ہجر ماہ کنعاں میں ہے یہ سیاحؔ کا
ہو گئی یعقوب آسا اب تو چشم تر سفید

باب ر

۲۸

ہے لعل لب پہ یار کے لعل یمن نثار — دندان آبدار پہ دُرّ عدن نثار
گیسو پہ اس کی کیوں نہ ہو مشک ختن نثار — آنکھوں پہ جان کرتے ہیں اپنی ہرن نثار
کچھ گوشت کے لئے نہیں قاتل ہوئے ہیں جمع — کشتے پہ میرے ہوتے ہیں زاغ و زغن نثار
تحریر وصف گیسو و چشم صنم کی ہے — خط کے سواد پہ میرے مشک و ختن نثار
نالے سے میرے قمری کا ہے رنگ باختہ — سرو رواں پہ میرے ہے سرو چمن نثار
اس لئے کسی میں میری رفاقت جو تم نے کی — جان اپنی تم پہ کرتا ہوں رنج و محن نثار
گردش نہیں ہے گردش چشمان یار پر — دن رات سر سے ہوتا ہے چرخ کہن نثار
تیر نگہ سناں مژہ تیغ غمزہ پر — دل صدقے ہے جگر ہے فدا جان و تن نثار

قمری ہے دل سے سرو قد یار پر فدا
رخسار گلعذار پہ مرغ چمن نثار

۲۹

افشاں نہیں یہ چمکی ہے ابروئے یار پر — جوہر کھلے ہیں نیمچۂ آبدار پر
پڑتی ہے آنکھ میری جو ابروئے یار پر — رکھتے ہیں ہاتھ دیکھ کے مجھ کو کٹار پر
یہ ضعف بعد مرگ تھا اپنے غبار پر — اٹھ اٹھ کے بیٹھ بیٹھ گیا کوئے یار پر
مثل گل چمن وہ ہے جوبن بہار پر — جوڑے ہیں پھول اور بھی طرہ ہے یار پر
پھبتی کہی ہے یہ سر پستان یار پر — سوسن کا پھول رکھا ہوا ہے انار پر
صحرا میں صید دل کو ارادہ ہے چھوڑ دوں — سنتا ہوں کل وہ آپ چلیں گے شکار پر
اس راہ میں جو خضر علیہ السلام آئیں — کھا جائیں زہر سبزۂ رخسار یار پر
تربت کو میری دیکھ کے بولا یہ کون تھا — حسرت برس رہی ہے یہ کس کے مزار پر
لی سینکڑوں کی جان ہزاروں کا خوں کیا — کیا کیا نہ رنگ لائی حنا دست یار پر
خط لے کے جو گیا تھا کبوتر ہوا وہ ذبح — نوچے ہوئے پڑے ہیں مگر تین چار پر
منت بر آئی جانے لگا جب کہ نجد کو — چادر چڑھائی قیس نے میرے مزار پر
اس سے خطا ہوئی ہے سر مو نہیں ہے فرق — ناقہ کی پھبتی جس نے کہی زلف یار پر
وحشت سے دل کے جامہ ہستی ہوا جو چاک — ٹھیک آ گئی قبائے فنا جسم زار پر

سیاحؔ ہنس کے کہتے ہیں اغیار آپ سے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اس گلعذار پر

باب س ۳۰

دیکھئے کیا رنگ لاتی ہے بہار اب کے برس — بے طرح رہتا ہے گردوں پر غبار اب کے برس
موج زن ہے ہر طرف ابر بہار اب کے برس — بلبلیں شاخوں پہ گاتی ہیں ملہار اب کے برس

کوہ و صحرا میں ہمارے دیدۂ خونبار سے
منزلوں پھولا ہوا ہے لالہ زار اب کے برس

مٹھیوں زر پھینکتے ہیں غنچۂ گل باغ میں
موتیوں کو ابر کرتا ہے نثار اب کے برس

ساکنان خاک برسوں سے ترے مشتاق ہیں
ایک دن تو آ کے اے ابر بہار اب کے برس

دوش پر اپنے لئے ہے سنبل پیچاں کمند
ٹیلیوں میں گل کے کرتی ہے شکار اب کے برس

شاہد گل کے بدن میں ہے قبائے زر فشاں
ہے زمرد گوں بساط مرغزار ہیں اب کے برس

جوش زن گل کی رگوں میں خوں نظر آنے لگا
ہاتھ میں نشتر لئے آتے ہیں خار اب کے برس

سبزۂ نوخیز نے ایسا اٹھایا اپنا سر
آنکھ سے چھپ چھپ گئے ہیں کوہسار اب کے برس

کیا عجب ہو جائے بانی سرو سے نازوں بلند
جوش پر آتے ہیں ہر دم جوئبار اب کے برس

دیکھئے اس نرگس گستاخ کی گستاخیاں
آنکھ اس گل سے لگی کرنے دو چار اب کے برس

قدرت نامی کا ایسا ہو رہا ہے زور شور
تھم نہیں سکتے شجر سے برگ و بار اب کے برس

شاخ بندی سے ہوا کی ڈالیاں ہل ہل گئیں
ہے گل و شمشاد میں بوس و کنار اب کے برس

ہاتھ پھیلاتے ہیں یا رب پھول کس کے شوق میں
شاخ گل کی جا بہ جا گتے ہیں چنار اب کے برس

حکم ہے گل کا خزاں آنے نہ پائے باغ میں
گرز کوتا ذکھڑے ہیں کو کنار اب کے برس

ہے جو اکثر بلبل و گل کی جدائی کا خیال
رو رہے ہیں سر جھکائے آبشار اب کے برس

رفتہ رفتہ خار صحرا سر اٹھاتے جاتے ہیں
دیکھئے کیا رنگ لاتے ہیں یہ خار اب کے برس

فصل گل صد حیف ہے سیاح آئی اور گئی
پر نہ آیا ایک دن بھی وہ نگار اب کے برس

باب ش
۳۱

ہے دل کو اس طرح سے مرے یار کی تلاش
جس طرح تھی کلیم کو دیدار کی تلاش

ہوں رند سر کھلا بھی جو ہووے تو ڈر نہیں
زاہد نہیں کہ مجھ کو ہو دستار کی تلاش

میں ہوں کہیں یہ آٹھوں پہر ہے اسی کی فکر
جاتی نہیں ہے دل سے مرے یار کی تلاش

دل ہاتھوں ہاتھ بک گیا بازار عشق میں
کرنی پڑی نہ مجھ کو خریدار کی تلاش

اپنے ہی دل میں ڈھونڈھنا لازم تھا یار کو
اتنے دنوں جو کی بھی تو بیکار کی تلاش

۳۲

بیعانہ نقد جاں کرو سیاح پیشکش
رہتا ہے ان کو ایسے خریدار کی تلاش

جس دم کرے گی باغ میں فصل بہار جوش
اس وقت لائے گا یہ دل بیقرار جوش

طاقت کہاں جو دل کو تھاموں ہزار جوش
غش کھا کے گر پڑا جو کئے تین چار جوش

اے پیر چرخ آہ دل مبتلا سے ڈر
یا م فلک اللہ دوں اگر آئیں چار جوش

باہر ابھی نکل پڑے سینے کو چاک کر
ہے کیا عجب کرے جو دل بیقرار جوش

تختۂ اللہ کے یہ نکل آئے گا قبر سے
عاشق کا دل کرے گا جو زیر مزار جوش

ٹھہرے گا شہر میں نہ بجز دشت کوہ کے — آیا دل حزیں کو اگر اب کے بار جوش

کھتا نہیں ہے گل سے کوئی اب تو رحم کر — کھاتا ہے باغ میں دل بلبل ہزار جوش

وعدہ خلاف یار نہ آیا صبح تلک — کھایا کیا یہاں دل امیدوار جوش

عاشق کی جان بچتی نہیں دل کے ہاتھ سے — لایا اسی طرح سے اگر تین چار جوش

بہہ جائیں گے گنہ خس و خاشاک کی طرح — جس دم کہ لائی رحمت پروردگار جوش

سیاحؔ حشر میں ہو جو تجھ سا گنا ہگار

کیونکر کرے نہ رحمت پروردگار جوش

ردیف ص
۳۳

رکھتے ہیں بیمار اب دنیا میں عنقا کا خواص — یار نے پیدا کیا جیسے مسیحا کا خواص

جس نے اس چتون کو دیکھا نشہ الفت چڑھا — جام چشم یار میں ہے صہبا کا خواص

پست رتبہ جو ہے اس سے اور بھی جھک کے ملے — چاہیے پیدا کرے انسان دریا کا خواص

سلبہ اجل مارا اسے جس کو ذرا بھی چھو گئی — صاف ناگن کا ہوا ہے زلف جاناں کا خواص

پھر بہار آتی ہے پھر ہوگا جنوں کا زور شور — کیا عجب ہر خلط میں پیدا ہوا سودا کا خواص

دشمن جاں ہوتا ہے جس سے کہ الفت کیجئے — یار پر کیا ہے یہی ہے ساری دنیا کا خواص

یار کے دست حنا میں روشنی ہے طور کی — ہاتھ میں اس شوخ کے ہے دست موسیٰ کا خواص

خط کے آتے ہی مریض عشق کی صحت ہوئی — قاصد جاناں بھی رکھتا ہے مسیحا کا خواص

نام سنتے ہیں مگر دیکھا نہیں ہے آج تک — ہے دہان یار میں بھی گویا عنقا کا خواص

وحشت دل اور بڑھ جاتی ہے کچھ سیاحؔ یاں

باغ بھی رکھتا ہے میرے حق میں صحرا کا خواص

ردیف ض
۳۴

دعوئ ہمسری مہ پہ ہے خط نوخیز — دل میں جو تھا نکل آیا ہے غبار عارض

واں نزاکت سے خیال لب پہ ہوا اور رنگ کبود — جب گیا چشم تصور میں حصار عارض

پیس ڈالا مجھے اس چشم کی گردش نے ولے — نہ بنا غازہ کہ آتا میں بکار عارض

کر دیا حسن کے نیرنگ نے اضداد بہم — خط سیہ شام خزاں صبح بہار عارض

گر جدا کرتے ہو ہر عضو وصیت بھی سنو — عاشق چشم ہوں اور عاشق زار عارض

نخل نرگس کے تلے آنکھیں مری دفن کریں — کیجئے سایۂ گیسو میں مزار عارض

خط ہے یا سبزۂ گل تر پہ ہے اللہ اللہ — کار زیبا ہے کہ ہے نقش و نگار عارض

ایک دل کی تو حقیقت نہیں سیاحؔ یہاں

لاکھ جاں صدقے تو سو روح نثار عارض

۳۵

ہوں وہ بلبل ہے مرے دم سے بہار عارض — کیوں ترقی پہ نہ ہو رشتۂ دقار عارض

تازگی دیکھ کے اس گل کی پڑی پھول پہ اوس — شبنم گل کی ہوا سے ہے بخار عارض

گل بے خار ہے جب تک کہ نہ خط نکلا تھا
اب تو یہ خط سیہ صاف ہے خار عارض

الفت گل سے رہے کیوں نہ عنادل کو حذر
موسم گل میں ہوئی فصل بہار عارض

آؤ شانہ دل صد چاک کا زلفوں میں کریں
دامن دل سے کریں پاک غبار عارض

موسم گل میں عجب کیا کہ خزاں سے شرم آئے
گل کھلے پھوٹے شگوفہ یہ ہے کار عارض

ظلمت خال سیہ نور رخ انور سے
میرے کاشانہ میں ہے لیل و نہار عارض

کام مجھ کو نہ چمن سے نہ گلوں سے مطلب
عندلیبانہ میں ہوں عاشق زار عارض

آنکھ وارفتہ رخ روح فدائے گیسو
جان شیدائے جبیں دل ہے نثار عارض

آنکھ آئینہ کی حیران ہے دم نظارہ
چشم بد دور وہ ہے عز و وقار عارض

خواب میں بوسے میں لوں گل کے وہاں بیٹھے ہوں
دم تعبیر ہے محسوس فشار عارض

لیٹو بستر پہ سنبھل کر مجھے اندیشہ ہے
گل قالیں کہیں ہو جائیں نہ خار عارض

ترک پھولوں کی محبت وہیں کر دے بلبل
باغ میں تم جو دکھا جاؤ بہار عارض

بے حساب آپ کے الطاف شب وصل میں ہیں
بوسۂ لب کو گنیں یا کہ شمار عارض

کارنامہ ہوا ارژنگ کا مطبوع عوام
اس سبب سے کہ لکھے نقش و نگار عارض

ہے گہن چاند پہ یا ابر سیہ میں خورشید
یا کہ یہ زلف سیہ ہے شب تار عارض

حیف منہ تکتے ہیں احباب تو مایوسانہ
حصہ غیر میں ہے بوس و کنار عارض

روش سبزۂ نوخیز ہے اطراف چمن
ہے نمو سبزۂ خط کی جو کنار عارض

زخم دل ہوں گے ہرے موسم گل میں سیاح
خار سب گل ہیں پئے سینہ فگار عارض

ردیف ک ۳۶

نہیں ملتا دلا ہم کو نشاں تک
مکاں ڈھونڈ آئے اس کا لامکاں تک

بنا ہر موئے تن خار مغیلاں
ستایا جوش وحشت نے یہاں تک

ہماری جان کے پیچھے پڑا ہے
دل ناداں کو سمجھائیں کہاں تک

رواں شب کو ہوا کیا ناقۂ روح
نظر آئی نہ گرد کارواں تک

زمیں پر زلزلہ آیا لو پہنچا
مرے نالوں کا غوغا آسماں تک

ملے ہے دل کو ذوق بوسۂ لب
مزا ہے ورنہ ہر شے کا زباں تک

جو رکھتے تھے دماغ اپنا فلک پر
زمیں پر اب نہیں ان کا نشاں تک

جلایا شمع سا اس شعلہ رو نے
گئے گھل سوز غم سے استخواں تک

بلا کر مہماں قاتل نے گھر میں
نہ دیئے جز داغ ہم کو گرم ناں تک

جہاں کی سیر سیاح ہم نے
نہ پہنچے پر سخن کے قدرداں تک

جوش پر جب سے ہے یہ دیدۂ گریاں آب تک
نوح نے بھی نہیں دیکھا ہو یہ طوفاں اب تک

تلوے غربال ہوئے خاروں کے صدمے سے مرے
چھانتا پھرتا ہوں میں خاک بیاباں اب تک

داغ کھا بیٹھے تھے فرقت میں کسی گلرو کے
رشک گلزار ہے یہ سینۂ سوزاں اب تک

سندھ و پنجاب کو تو خوب سے چھانا ہم نے
پر ملا کوئی نہ دانندۂ سخنداں اب تک

جوش وحشت سے جو ہوں بادیہ پیما سیاح
آبلوں میں ہیں مرے خار مغیلاں اب تک

۳۸ ۔ نہ ہو زار دل سے لب آشنا کہ یہ بات اپنی سخن تلک
بے مزا سخن میں نبات کا جو نبات آئے دہن تلک

جہاں ایک جا تھے ہزار گل ملے خاک میں وہ چمن تلک
جہاں بلبلوں کے تھے چہچہے نہیں واں صدائے زغن تلک

مرا عشق ہو گیا پردہ در رہی نہ رخت کی نہ کچھ خبر
گیا اپنے جامہ سے میں گذر کیا پرزے پرزے بدن تلک

در یار پر جو ہوا فنا کوئی ڈر سے یہ بھی نہ کہہ سکا
کہ تری گلی میں وہ مر گیا نہ ہوا نصیب کفن تلک

ہے بہار کا یہ سماں بوستاں کہ قبا گلوں کی ہے زرفشاں
مگر آہ دہشت باغباں کیا بند باب چمن تلک

کہیں دام ہے تو کہیں قفس ہیں ہزار محنتہ پیش و پس
رہے لوٹتے ہی سیر چمن کے ہوس کہ نہ پہنچے سرو سمن تلک

ہوں اسیر زلف نگاہ میں ہے قرار دل کے قرار میں
کبھی ہوں سواد تتار میں کبھی پہنچا چین و ختن تلک

اسے اپنے جامہ پہ ہے نظر نہیں دیکھتا وہ ادھر ادھر
یہ مجال کیا ہو کوئی بشر چھوئے اس کے جامہ تن تلک

مرا دل ہے صورت آئینہ رخ یار کا ہے صفایہ
کسی زشت رو سے ہو آئینہ نہ پڑے جبیں پہ شکن تلک

جو تھے یار ہمدم و آشنا ہوئے اپنی اپنی طرف رواں
مگر آہ رہ گئی تن میں جاں مرے ساتھ رنج و محن تلک

گیا دور چرخ نے در بدر پھرے جنگلوں میں ادھر ادھر
چھٹے گھر سے لٹ گیا مال و زر ہوا ترک ہم سے وطن تلک

ہوا بند رزق کا جس پہ در دیا دست و پا نے اسے ضرر
گرا لقمہ ہاتھ سے چھوٹ کر جب اٹھا کے لائے دہن تلک

غم و رنج کا نہ رہے نشاں ہوا روانہ درد کا کارواں
ہو گزر ترا میاں داد خاں جو مزار شاہ زمن تلک

ردیف ل

کس طرح خوں ہو کے نہ آنکھوں میں آئے دل
دل میں جو غم سمائے تو بر میں سمائے دل

۳۹ ۔ پردہ میں لاکھ سینہ کے انساں چھپائے دل
تیر نگاہ یار سے کیونکر بچائے دل

سمجھے ہوئے ہیں دل میں ہے جو کچھ بھرا ہوا
یہ حکم ہے کہ لب نہ ہلا مدعائے دل

ہے دوست کو عزیز تو ہم کو عزیز تر
دل ہے فدائے یار تو ہم ہیں فدائے دل

مجھ سا ضعیف کیونکر عدم تک پہنچ سکے
جو ناتواں ہو کیونکہ جہاں سے اٹھائے دل

دیکھوں کسی کی چیز جو کوئی کھوئی ہوئی
بے اختیار منہ سے نکل جائے ہائے دل

دنیا سے بے خبر نہ ہوں کس طرح ہجر میں
ٹوٹا پڑا ہے ساغر گیتی نمائے دل

سوز دروں سے چین ملے ہم کو کس طرح
دوزخ یہاں ہے سینہ میں اپنے بجائے دل

دشمن ہیں تراک دار یہ کیا جانتے نہ تھے
کیوں ان سے کہنے بیٹھ گئے ماجرائے دل

الزام کس کو دیجئے سیاح عشق میں
کچھ آنکھ کا قصور ہے کچھ ہے خطائے دل

ردیف م

۴۰ —

پاتے نہیں فراغ ہجومِ فغاں سے ہم — تنگ آ گئے ہیں ہجر میں اپنی زباں سے ہم
بہ خوگرِ ستم ہوئے ہجرِ بتاں سے ہم — ایک چھیڑ خود نکالتے ہیں آسماں سے ہم
اب بھی بلند بھی ہوئی ہے ہوا اپنی ہر جگہ — نکلے ہیں بوئے گل کی طرح گلستاں سے ہم
کیا زیرِ خاک چین ملا ہے کہ بعدِ مرگ — چونکے نہ روزِ حشر بھی خوابِ گراں سے ہم
شاید انہیں یہ طرزِ فسانہ کوئی سنائے — کہتے ہیں اپنا حال ہر اک قصہ خواں سے ہم
یوں ناتواں ہوں بس کہ کروٹ بھی ہے محال — حسرت یہ ہے کہ کیونکر اٹھیں گے جہاں سے ہم
صیاد اپنے دام سے ہر جا ہیں ہوشیار — نکلے نہیں ہنوز کبھی گلستاں سے ہم
کب تک نشانِ ہوش کو رہنا ہے دیکھئے — مانگیں ہی جائیں آج تو پیرِ مغاں سے ہم
کیا کیا نشان دیکھتے ہی دیکھتے مٹے — داغ اک جہاں کا لیکے چلے ہیں جہاں سے ہم

بھولے نہ بعدِ مرگ سیاحت کے لطف کو
سیاح لے گئے ہیں یہ تحفہ جہاں سے ہم

ردیف ن

۴۱

بال بکھرے ہیں خود پریشاں ہیں — آئینہ سامنے ہے حیراں ہیں
دل میں سو حسرتیں ہیں ارماں ہیں — موت آنے کے یہ بھی ساماں ہیں
کون گلشن میں رشکِ گل آیا — ہوش بلبل کے جو پریشاں ہیں
مجھ کو دم دے کے لے گئے دل و جاں — کون کہتا ہے ان کو ناداں ہیں
ہیں یہ جراح کا لیا احساں — اس حماقت پہ زخم خنداں ہیں
رہ چکا بس قلمرو امکاں — گریہ ہی جوشِ اشک طوفاں ہیں
شبِ فرقت بھی گزرے گی آساں — بیخودی کے یہ مجھ پہ احساں ہیں
ہے ازل سے مرا گریباں چاک — دشتِ وحشت یہ سب بیاباں ہیں
چاہِ کنعاں نہیں جو آئیں نکل — ہم اسیرِ چہِ زنخداں ہیں
جب سے آئے ہیں شہر سورت میں — دفترِ اشعار کے پریشاں ہیں

دل کسی کو دیا ہے کیا سیاح
یا فقط جھوٹ تجھ پہ بہتاں ہیں

۴۲ —

بات کیا ہے سانپ کو لیتا فسونگر ہاتھ میں — ہیں وہ منتر یاد لیں زلفِ معنبر ہاتھ میں
کیوں نہ رکھیں ہمدمو ہر وقت ہمسر ہاتھ میں — ان دنوں قاتل لئے پھرتا ہے خنجر ہاتھ میں
عکس سے رنگِ حنا کے صاف سونے کا بنے — پہنے گر وہ سیمبر چاندی کا زیور ہاتھ میں
مرغِ دل پھندے میں زلفوں کے اسی دن سے پھنسا — جب لئے پھرتے تھے تم پر کے کبوتر ہاتھ میں

ہوں غزل میں شعر سب بہتر یہ ممکن ہی نہیں　　کب ہوئی ہیں انگلیاں پانچوں برابر ہاتھ میں

کھا نہ غم سیاح روزِ حشر کا تو بار بار

ہوگا دامانِ پیمبر روزِ محشر ہاتھ میں

۴۳

پاس کس کا شعراء کرتے ہیں　　جھوٹ سچ بیٹھے بکا کرتے ہیں

اک نہ اک سر پہ بلا آتی ہے　　باد جب زلف دوتا کرتے ہیں

چاہ میں تیری حُسن اے بحرِ صفا　　اشک چشموں سے بہا کرتے ہیں

چشمِ نرگس کو دکھاتے ہیں وہ آنکھ　　گُل پہ گلشن میں ہنسا کرتے ہیں

دل کو یادِ مژۂ قاتل میں　　ہدفِ تیر بلا کرتے ہیں

ہم نے پوچھا جو مزاج ان کا کل　　ہنس کے بولے کہ دعا کرتے ہیں

جان دیتے ہیں دل آزاروں کو　　بے وفاؤں سے وفا کرتے ہیں

سرِ قلم جُرمِ محبت پہ کیا　　تن سے اب پوست جُدا کرتے ہیں

ہے یہی مہر و محبت سیاح

جو یہ محبوب کیا کرتے ہیں

۴۴

تلاشِ یار میں اس نے بھی رگڑی ایڑیاں برسوں　　مری صورت سے چکر میں رہا ہے آسماں برسوں

گلابی اشک جو فرقت میں نکلے ڈر گیا اے دل　　ابھی تو خون رلوائے گا تجھ کو آسماں برسوں

مگر محمل نظر آجائے اس لیلیٰ شمائل کا　　پھرا ہوں لے سرِ دیا مثلِ گردِ کارواں برسوں

کوئی کہہ دے ہُما سے پوچھ لے تو ذائقہ اس کا　　سگِ جاناں نے کھائے ہیں ہمارے استخواں برسوں

ہمیشہ ہجر کا صدمہ کبھی ہم سے نہ اُٹھے گا　　وہی یہ غم اُٹھائیں جو رہے ہیں شادماں برسوں

اُسی کے عشق میں طوق و سلاسل ہم نے پہنا ہے　　گلے میں جن کے منت کی رہی ہیں ہنسلیاں برسوں

محبت میں یہ لازم ہے سرِ تسلیم خم ہوئے　　شکایت کیا جو پہنا یا ہمیں طوقِ گراں برسوں

یہ غم ہوتا ہے تا م ہجر سے دل کانپ جاتا ہے　　شبِ فرقت میں گھٹ گھٹ کر رہی ہے میری جاں برسوں

مرا منہ کھل گیا سیاح اس کی بد زبانی سے

وگرنہ بند میں نے منہ میں رکھی تھی زباں برسوں

۴۵

صید میں طائرِ دل کے ہیں ہوا پر پلکیں　　چشم ہم پنجۂ شاہیں تو شہپر پلکیں

اشک سے رہتی ہیں ہر لحظہ مری تر پلکیں　　عین دریا میں شناور ہیں برابر پلکیں

ہیں سوا ابروے جاناں سے ستمگر پلکیں　　تیغ خونبار اگر وہ ہے تو خنجر پلکیں

چشمِ بد دُور عجب شرم و حیا ہے ان کو　　وصل کی شب بھی اُٹھاتے نہیں دم بھر پلکیں

پیچ میں زلف کے کنگھی جو اُلجھ جاتی ہے　　دیکھتی ہیں رُخِ مشاطہ کو مڑ کر پلکیں

صبح ہو جاتی ہے ہر شب مجھے روتے روتے　　آشنا خواب سے ہوتی نہیں دم بھر پلکیں

ایک سے ایک سوا ناز و کرشمہ میں ہے | پلکیں آنکھوں سے سوا آنکھوں سے بہتر پلکیں
قتل کرنے کو مرے واسطے بن جاتی ہیں | کبھی برچھی کبھی نیزہ کبھی خنجر پلکیں
عیب کو دیدۂ مردم سے چھپا لیتا ہوں | جس طرح آنکھ چھپا لیتی ہیں ڈر کر پلکیں
کھینچتے ہیں جو وہ غصہ سے کمان ابرو کے | تیر کی طرح گذر کرتی ہیں دل پر پلکیں
لعلِ لب کا جو ترے عکس نظر آتا ہے | میرے اشکوں کے گرانی ہیں یہ گوہر پلکیں
چشمِ میگوں کے تصور میں جو خوں روتا ہوں | ہاتھ میں رکھتی ہیں جام مئے احمر پلکیں
ساتھ نظارہ کے مدہوش ہوئی جاتی ہیں | چشم میں پاتی ہیں کیفیتِ ساغر پلکیں
کیا کوئی اسکی اداؤں سے بچائے دل کو | چشم قتال ہے نگہہ قہر ستمگر پلکیں

کیا کہوں عشق نے کیا حال کیا اے سیاح
خشک لب گرم فغاں سرد نفس تر پلکیں

۴۶ - بعد میرے نہ ملی اس سے حنا ہاتھوں میں | مدتوں خون کا مرے رنگ رہا ہاتھوں میں
اس مسیحا کی ہے تصویر سدا ہاتھوں میں | مرضِ عشق کی رکھتا ہوں دوا ہاتھوں میں
نہ رہا دورِ جوانی کا مرا ہاتھوں میں | گو بڑا کانپ کے تھاما جو عصا ہاتھوں میں
خوں یہ کس عاشقِ شیدا کا ملا ہاتھوں میں | زعفرانی جو ہوا رنگ حنا ہاتھوں میں
میرے گلشن میں عجب رنگ سے آتی ہے بہار | گردِ برف کو لاتی ہے ہوا ہاتھوں میں
کہیں آغوشِ لحد کے نہ سوا آیا چین | جا بچا لے گے پھری مجھ کو قضا ہاتھوں میں
ساتھ انگلی کے اشارے کے ستا پڑتی ہے | ناخنِ دست ہیں شمشیرِ قضا ہاتھوں میں
اپنے جامہ سے ہوا جاتا ہے باہر وہ شوخ | تھام لیتا ہوں جو دامانِ قبا ہاتھوں میں
آگیا ذکرِ خدا میں جو بتوں کا چرچا | سبحہ سو بار دھرا اور لیا ہاتھوں میں
تو ہی اے بندِ قبا اپنی مدد کر آ کے | دل چرائے ہے مرا دزدِ حنا ہاتھوں میں
قیدیِ زلف نہ زنجیر سے الجھے کیونکر | اک سرا پاؤں میں ہے ایک سرا ہاتھوں میں
فصل نے رنگ نزاکت کا دکھایا کیا کیا | ایک بھی پھول نہ گلچیں سے اٹھا ہاتھوں میں
تنِ لاغر کو مرے حاجتِ حمال نہیں | مشتِ خاک اپنی اٹھا لیگی صبا ہاتھوں میں
زلفِ جاناں جو کبھی ہاتھ میں آجاتی ہے | ناگ میں جیسے لپٹتی ہے بلا ہاتھوں میں
تیرے دیوانہ کو پھر حاجتِ زنجیر نہ ہو | اے پری باندھ دے گر زلفِ دوتا ہاتھوں میں

آئے ایامِ ضعیفی کے ہیں دیکھے سیاح
گھٹ گیا زور ہوا ضعف سوا ہاتھوں میں

ردیف و

۴۷ ناصح یہ منعِ عشق ستم پر خفا نہ ہو | اے گلعذار مائل جور و جفا نہ ہو
ہر چند دیر رو نہ قیامت میں ہے مگر | رفتارِ یار سے کوئی فتنہ بپا نہ ہو

آئینہ سامنے ہے تو شانہ ہے ہاتھ میں — مانا کہ خود پسند ہے پر خود تمانہ ہو
پہلو میں تھا ابھی تو مرا دل پر اب نہیں — وہ دلربا غضب سے کہیں لے گیا نہ ہو
عیسیٰ کے لانے کی ہے عبث فکر ہمدمو — یہ وہ مرض ہے جس کی کسی سے دوا نہ ہو
رہتی ہے دمبدم جو یہ ہچکی لگی ہوئی — بھولے سے مجھ کو یاد کسی نے کیا نہ ہو
لو محتسب کو راہ میں اے مے کشو اٹھو — میخانہ میں ذلیل برائے خدا نہ ہو
کیفیت اور چیز ہے جس پر مدار ہے — پانی سے بادہ خوار کی حاجت روا نہ ہو
ظلِ کرم ہے حضرتِ غالب کا بس مجھے — سر پر نہیں ہے سایۂ بالِ ہما نہ ہو

تعمیل امر حضرتِ مائل ضرور ہے
سیاح گرچہ طبع ہماری رسا نہ ہو

۴۸ - جس شخص کے پہلو میں نہ دل ہو نہ جگر ہو — پھر کیا اسے تیرِ نگہِ یار سے ڈر ہو
ملتا ہے بھلا کب دلِ گم گشتہ ہمارا — جس کا کہیں کچھ کھوج ٹھکانا ہو نہ گھر ہو
وہ آ دیں دیا مجھ کو بلا لیویں گھر اپنے — اللہ مری آہ میں اتنا تو اثر ہو
کیوں تنگ نہ مرے نالہ و فریاد و فغاں سے — چکر میں فلک آئے جہاں زیر و زبر ہو
ناحق نہ ڈراؤ ہمیں بس آنکھیں دکھا کر — ہاں قتل پہ تم شوق سے باندھے جو کمر ہو
طولِ شبِ فرقت کا گلہ کیجئے اس سے — اے جان جسے وصل میں امیدِ سحر ہو
دل کو تو لئے بیٹھے ہو اب چاہتے کیا ہو — لو جان بھی حاضر ہے اگر مدِ نظر ہو
کیا لیتے ہو دل یہ تو ہزاروں نے دیا ہے — وہ کیجئے طلب ہم سے نہ جو حدِ بشر ہو
آتش ہے جہاں سوز یہ رہ جائے ٹھہر کر — اس سینۂ سوزاں کے مقابل میں اگر ہو
آیا ہے عجب طور کا یہ دورِ زمانہ — جو عیب ہے دنیا میں وہ مشہور ہنر ہو

جا سیر کر و ملکِ عجم اور عرب کی
سیاح اگر آپ کے تمکیں عزمِ سفر ہو

۴۹ - سنگِ الم سے شیشۂ دل چور ہو تو ہو — پیمانہ اپنی عمر کا معمور ہو تو ہو
ہم ایک در کو چھوڑ کے جاتے نہیں کہیں — گر اور کا حضور یہ دستور ہو تو ہو
مدت سے چرخِ پیر کا روشن چراغ ہے — اک شب جو بزمِ شمع سے پر نور ہو تو ہو
ہاں سچ تو ہے کہ آپ کو کیا کام درد سے — یا پوش سے اگر کوئی رنجور ہو تو ہو
کوئی مرے یا کوئی جیئے کیا غرض بھلا — گر اور کے کلیجے میں ناسور ہو تو ہو
نزدیک اپنے آپ سے بہتر نہیں کوئی — جنت میں اس طرح کی کوئی حور ہو تو ہو
تجھ بن مری نظر میں سماتا نہیں کوئی — گر اور لاکھ حسن میں مشہور ہو تو ہو
یہ ناز یہ ادا ہو تو البتہ بھائیے — یوں اپنے حسن پر کوئی مغرور ہو تو ہو

الفت میں حال ایک ہے شاہ و فقیر کا — خاقان و شاہ و قیصر و فغفور ہو تو ہو
روشن ہے بزم عارضِ تابانِ یار سے — چہرہ سے رنگ شمع کا کافور ہو تو ہو
سیاحؔ بجز خدا کے کسی سے نہ کام رکھ
انساں ہو یا پری ہو اگر حور ہو تو ہو

۵۰ قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو — خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو
چارہ لب دیکھ کے مجھ کو مرے عیسیٰ نے کہا — لا دوا درد ہے یہ کیا کروں مر جانے دو
لال ڈورے تری آنکھوں میں جو دیکھے تو کہا — مئے گلرنگ سے لبریز ہیں پیمانے دو
ٹھہرو تیوری کو چڑھائے ہوئے جاتے ہو کدھر — دل کا صدقہ تو ابھی سر سے اُتر جانے دو
منع کیوں کرتے ہو عشقِ بتِ شیریں لب سے — کیا مزے کا ہے یہ غم دوستو غم کھانے دو
ہم بھی منزل پہ پہنچ جائیں گے مرتے کھپتے — قافلہ یاروں کا جاتا ہے اگر جانے دو
شمع و پروانہ نہ محفل میں ہوں باہم زنہار — شمع رو نے مجھے بھیجے ہیں یہ پروانے دو
ایک عالم نظر آئے گا گرفتار تمہیں — اپنے گیسوئے رسا تا بہ کمر جانے دو
سخت جانی سے میں عاری ہوں نہایت اے ترک — پڑ گئے ہیں تری شمشیر میں دندانے دو
ہمدمو دیکھو الجھتی ہے طبیعت ہر بار — پھر یہ کہتے ہیں کہ مرتا ہے تو مر جانے دو
حشر میں پیشِ خدا فیصلہ اس کا ہوگا — زندگی میں مجھے اُس گبر کو ترسانے دو
گر محبت ہے تو وہ مجھ سے پھرے گا نہ کبھی — غم نہیں ہے مجھے غماز کو بھڑکانے دو
جوشِ بارش ہے ابھی تھمتے ہو کیا اے اشکو — دامنِ کوہ و بیاباں کو تو بھر جانے دو
واعظوں کو نہ کرے منع نصیحت سے کوئی — میں نہ سمجھوں گا کسی طرح سے سمجھانے دو
رنج دیتا ہے جو وہ پاس نہ جاؤ سیاحؔ
مانو کہنے کو مرے دُور کرو جانے دو

ردیف ہ
۵۱ یہ شبِ وصل ہے رکھنا نہ تہِ سر تکیہ — ہاتھ کا میرے بنا اے مہِ انور تکیہ
مسندِ فقر پہ زاہد نہ ہو کیونکر تکیہ — ہم فقیروں کو ہوا فضلِ خدا پر تکیہ
لطفِ املاک و عمارت ہو امیروں کو نصیب — فضلِ خالق سے فقیروں کا ہوا گھر تکیہ
گل و گلزار کو بو پاس سے دیتا ہے حجاب — بس گیا ہے جو ترے زلفِ معنبر تکیہ
کس پہ میں ناز کروں کوئی نہیں اسکے سوا — دست بر دست کیا کرتے ہیں اکثر تکیہ
فیضِ گیسوئے معنبر سے عجب کیا اس کا — طعنہ زن ہو جو ختا اور ختن پر تکیہ
لیٹا آکے جو شۂ حسن وہ بستر پہ مرے — ہو گیا مسندِ شاہی کے برابر تکیہ
بر تمنائے دلی میری بر آئی اکثر — آج زانو پہ مرے کیجئے دم بھر تکیہ
کام مجھ کو نہ گنہ سے نہ عبادت سے غرض — بس شفاعت پہ ہے اے شافعِ محشر تکیہ

مُنہ چڑھا قاتلِ سفاک کے وقتِ راحت
مثل اپنا نہیں رکھتا ہے مقرر تکیہ

ناتوانی کے سبب سر کا اٹھانا تھا محال
عمر بھر قیس نے رکھا نہ تہہ سر تکیہ

سمجھے یہ رمز اشارہ ہے کہ ہم بستر ہو
اس نے مارا ہے شبِ وصل جو مجھ پر تکیہ

کیسہٗ نافہٗ مشکِ ختنی گرد ہوا
زیرِ سرِ یار نے رکھا ہے جو شب بھر تکیہ

زیرِ سر ہاتھ کو رکھ لو یہ ہے بہتر سیاح
دشت گردی میں نہیں ہے جو میسر تکیہ

۵۲ رفع غم چاہے تو کر اپنے خدا پر تکیہ
بیٹھ رہ پھر کسی جنگل میں بنا کر تکیہ

رشک کیوں کر نہ ہو تکیوں کی ہم آغوشی کا
کاش پہلو کا بنا تا مجھے دلبر تکیہ

حال کس سے کہوں جا کر شبِ تنہائی کا
تارِ بستر ہے اگر تیر تو خنجر تکیہ

دوست دشمن ہیں یگانے ہوئے سب بیگانے
اب زمانے میں بھلا کیجئے کس پر تکیہ

اپنے یاروں نے تو ویرانہ کیا بستی کو
کیسا آباد ہے آبادی کے باہر تکیہ

شکر ہے مجلسِ اغیار میں ممتاز ہوا
میرے سر یار نے مارا جو اٹھا کر تکیہ

فتنہ انگیز یاں اس فتنہٗ دوراں کی یہ ہیں
فتنے کے عطر سے رکھتا ہے معطر تکیہ

بات کرنے کا سلیقہ نہیں جسکو اب تک
اعتراضات پہ کرتے ہیں وہ اکثر تکیہ

مختصر چاہیئے اسباب تعلق سیاح
بوریا بس ہے تجھے پھینک دے چادر تکیہ

۵۳ نادان تملط سمجھتے ہیں تو قیر زر کے ساتھ
عزت بشر کو ملتی ہے علم و ہنر کے ساتھ

سونا نہیں ہے خوب کسی سیمبر کے ساتھ
دل پر لکھیں گے نقش یہ ہم آبِ زر کے ساتھ

کیا کام اس کو خنجر و تیغ و تبر کے ساتھ
کرتا ہے جو صفوں کو قلم اک نظر کے ساتھ

کہدو سنبھل کے مے کدہ میں آئے محتسب
ٹوٹیں گے خُم ضرور مگر اس کے سر کے ساتھ

مغرور کیا ہے دولتِ دُنیا پہ او دنی
اکسیر خاک ہوتی ہے اپنی نظر کے ساتھ

دیتا پیام قیس کے مانند راہ پھر
در تک صنم کے میں بھی چلوں نامہ بر کے ساتھ

جاتا ہے یار وصل کی شب ہو چکی تمام
دل نالہ کش ہے نالۂ مرغِ سحر کے ساتھ

ہر دل عزیز ہوتا ہے انسان فیض سے
ممتاز تیشکر ہے جہاں میں شکر کے ساتھ

سیاح تا بہ سلسلہ وگرسی ہے اپنی سیر
پاتا نہیں یہ نام زمیں کے سفر کے ساتھ

جنت میں عاشقوں کا بھلا کیا لگے گا دل
نقشہ ملا نہ اس کا اگر تیرے گھر کے ساتھ

بازار یا جیوں کا بڑودہ میں گرم ہے
دیکھا عراقیوں کا دواں بال ہے خر کے ساتھ

ردیف ہ ی
[illegible]

ہمارے عشق کی جو ان دلوں عالم میں شہرت ہے
کہوں کیا کس قدر احباب سے حاصل ندامت ہے

منور گھر ہے اپنا شمع رو سے آج خلوت ہے
چلے کبھو نگر نہ پروانہ یہ اپنی اپنی قسمت ہے

چلا تو پاس سے اٹھکر ہماری جان جاتی ہے
ارے او بے وفا بے باک یہ کیسی قیامت ہے

چراغ اکثر ہوا کرتا ہے روشن وقت بجھنے کے
ہوا کیا گر ترے بیمار نے پائی افاقت ہے

غرور اتنا نہ کر او خودنما تو اپنی صورت پر
ملیں گے اور سے ہم تمام اس بستی کا سورت ہے

لیا دل کو نصیحتوں نے مرے کیا کیا خوشامد سے
گر ہم بھی سمجھتے تھے کہ یہ دونوں کی چاہت ہے

حباب بحر کو ہرگز نہ پایا دیر پا ہم نے
بھروسہ زندگی کا کیا یہی اک دم کی مہلت ہے

چرانے ہو نظر کیوں اجنبی تو کچھ نہیں اب ہم
ہماری آپ کی مدت سے اک صاحب سلامت ہے

جگر کے زخم تو سب بھر چکے ہیں لیکن اے ہمدم
فقط ہے داغ دل سو عاشقی کی وہ علامت ہے

بجا ہیں کج رو و بد طینت وہی یاں فیض پاتے ہیں
ہمارے حضرت سرکار سے یہ ہم کو حیرت ہے

مقام عاشقی میں بوالہوس ہوشیار ہو بیٹھیں
کہ ملک عشق کی سیاح نے پائی نظامت ہے

۵۵ زندہ کب کوچۂ قاتل سے قضا لائے گی
جوئے خوں آئے گی تو لاش بہا لائے گی

لے چلے گور میں ہے حسرت دیدار صنم
کیا خدا کا مجھے دیدار دکھالائے گی

لاش کی کھال بھی کھنچوائیگا گر اے قاتل
ہر لب زخم سے وہ شکر بجالائے گی

۵٦ بے وفا سا بے وفا دیکھا تجھے
جو سنا اس سے سوا دیکھا تجھے

کیا کہوں اے بت کہ کیا دیکھا تجھے
دشمن خلق خدا دیکھا تجھے

دل لیا بوسہ دیا تو نے نہ یار
اپنے قول کا آشنا دیکھا تجھے

سرو کیا تجھ سے کرے گا خوش قدی
اس سے دونا خوشنما دیکھا تجھے

روبرو آئینہ رہتا ہے سدا
خودنما سا خودنما دیکھا تجھے

چرخ کیا ہے عشوہ گر اے چشم یار
اس سے یک حصہ سوا دیکھا تجھے

دور سے برسوں میں آتا ہے نظر
چاند ہم نے عید کا دیکھا تجھے

ہم نے اکثر در حریم عشق کو
بھول جانے اے قضا دیکھا تجھے

عاشقوں کے خوں سے گلگوں ہے قبا
قاتل رنگیں ادا دیکھا تجھے

لن ترانی ہے عبث اب اے صنم
سات پردوں میں چھپا دیکھا تجھے

جب سے ہم نے دل لیا تجھ سے اٹھا
سب کی نظروں سے گرا دیکھا تجھے

خواب میں دیکھا تو اندھوں کی طرح
جاگتے ہیں خواب سا دیکھا تجھے

تیرے گاہک ہیں زن و مرد آج کل
یوسف اپنے عہد کا دیکھا تجھے

خرمن دل پر نہ بس بجلی گرا
خندۂ دنداں نما دیکھا تجھے

جھانکنے بغلیں لگے اغیار سب
ہم نے جس دم آنکھ اٹھا دیکھا تجھے

آشنائی کا تری کیا اعتبار
ہر کسی کا آشنا دیکھا تجھے

دل میں کچھ الفت نہ آنکھوں میں حیا
شوخ چشم اور بے حیا دیکھا تجھے

عشق میں رسوا ہوا سیاح تو
ایک میں تھا دوسرا دیکھا تجھے

٥٧ دو چنداں ماہ کنعاں سے تری تصویر بہتر ہے
قمر سے مہرِ تاباں سے کہیں تنویر بہتر ہے

عزیزِ مصر سے رُخ کی کہیں تنویر بہتر ہے
سلیماں سے تمہاری عزت و توقیر بہتر ہے

ابھی کس طرح بوسہ لوں نقابِ زلف ہے رُخ پر
جو دن ہو ابر کا افطار میں تاخیر بہتر ہے

نہیں ہے سُرمۂ دنبالہ دار اس چشمِ فتاں میں
غزالِ چشمِ وحشی کو بھی زنجیر بہتر ہے

بجز اک تیر یہ قوسِ قزح بیکار رہتی ہے
قدِ خم گشتہ کو آہِ رسا کا تیر بہتر ہے

ہزاروں شیشۂ دل کاٹ ڈالے تیغِ ابرو نے
جو بوتل لیتی ہے بے شبہ وہ شمشیر بہتر ہے

تو چھپ کر میرے گھر آیا ہوا مطلب مرا حاصل
تری تدبیر بہتر ہے مری تقدیر بہتر ہے

کتابِ رُخ کے اوپر حاشیہ خط کا مناسب ہے
برائے مصحفِ عارض یہی تفسیر بہتر ہے

مرے دل سے کوئی تیرِ نگہ کی قدر کو پوچھے
ہدف سے جو کوئی ہو آشنا وہ تیر بہتر ہے

کریں گے بختِ خوابیدہ کا شکوہ اپنی مہرو سے
حسیں سے لیجئے گر خواب کی تعبیر بہتر ہے

پڑھا خط اور پیغامِ زبانی سُن کے بول اُٹھے
نہ وہ تحریر بہتر ہے نہ یہ تقریر بہتر ہے

طریقِ عشق میں علم و عمل سب رائیگاں دیکھا
یہ نقشِ زر زمانے میں پئے تسخیر بہتر ہے

بنائے سقفِ عالی اور عمارت سب ہے ناقائم
جو ہو آبادِ بیتِ دل یہی تعمیر بہتر ہے

جو لا دے نامہ بر تو دولتِ کونین حاصل ہو
ترے مکتوب سے کب نسخۂ اکسیر بہتر ہے

خیالِ زلف میں جب سلسلہ جنباں جنوں ہووے
پئے سیاح وحشت میں یہی زنجیر بہتر ہے

٥٨ جلوۂ رُخ سے بڑھا حُسنِ خرامِ ناز ہے
ہر قدم پر چادرِ مہتاب پا انداز ہے

پنجۂ رنگیں بہارِ گلشنِ اعجاز ہے
طائرِ رنگِ حنا بھی زمزمہ پرداز ہے

شورِ محشر کا بپا ہے ناز کی رفتار سے
ہر قدم خلخالِ پا سے صور کی آواز ہے

کام لیتا ہے اشاروں سے وہ اپنے تیر کا
تُرکِ چشمِ مستِ جاناں طرفہ تیرانداز ہے

مشتعل ہے بزم میں شعلہ جو اسکے حُسن کا
شمع پروانوں سے جو پائے پر پرواز ہے

مے کشی سے منع کرتا ہے جوانی میں ہمیں
توبہ کر زاہد ابھی بابِ اجابت باز ہے

دخترِ رز لیلیٔ ہودج نشیں سے کم نہیں
قلقلِ مینائے ساقی رنگ کی آواز ہے

سر اُٹھا کر دیکھتے ہیں غنچہ و گُل شاخ سے
جلوہ گر گلشن میں شاید وہ بُتِ طناز ہے

صید کرنے کے لئے مُرغِ دلِ عشاق کے
طائرِ رنگِ حنا ہم پنجۂ شہباز ہے

جان دینا بات پر باتوں میں ہو جانا خفا — یہ نیاز عاشقاں ہے وہ تمہارا ناز ہے
گلشن ہستی کی اے سیاح یہ دیکھیں بہار
چشم گل محو تماشائے چمن پرداز ہے

٥٩ کون صیاد ادھر بہر شکار آتا ہے — طائر دل قفس تن میں جو گھبراتا ہے
زلف مشکیں کا جو اس شوخ کے دھیان آتا ہے — زخم اس سینۂ مجروح کا چر جاتا ہے
ہجر میں موت بھی آئی نہ مجھے سچ ہے مثل — وقت پر کون کسی کے کوئی کام آتا ہے
اب تو اللہ ہے یاران وطن کا حافظ — دشت میں جوش جنوں ہم کو لئے جاتا ہے
ڈوب کر چاہ ذقن سے نہ مرا دل نکلا — قد آدم سے سوا آب نظر آتا ہے
مژدہ اے دل کہ مسیحا نے دیا صاف جواب — اب کوئی دم کو لبوں پر مرا دم آتا ہے
تیغ سی چلتی ہے قاتل کی دم جنگ زباں — صلح کا نام جو لیتا ہے تو ہکلاتا ہے
طرۂ کاکل پیچاں رخ نورانی پر — چشمۂ آئینہ میں سانپ سا لہراتا ہے
شوق طوف حرم کوئے صنم تا دن رات — صورت نقش قدم ٹھوکریں کھلواتا ہے
دو بدو عاشق شیدا سے وہ ہوگا کیونکر — آئینہ میں بھی جو منہ دیکھتے شرماتا ہے
سخت پچھتاتے ہیں ہم دے کے دل اس کو سیاح
اپنی افسوس جوانی پہ ہمیں آتا ہے

٦٠ سرکے ورنہ سنگ جاناں لڑے اے ہما تجھ سے — ہمارا ہڈیوں پر دانت ہے اسکا سوا تجھ سے
عدم سے آئے ہستی میں تجھی کو دیکھنے اے بت — جدائی سے نہیں مطلب نہیں ہے مدعا تجھ سے
جو دے گا غسل آب تیغ سے انکو تو اے قاتل — نہ لیں گے حشر کو بھی بہتر کشتے خوں بہا تجھ سے
سزا تو ہے نہیں گاہک خریدار اسکے لاکھوں ہیں — دل اپنا پھیر لوں گا گر نہ کچھ سودا بنا تجھ سے
غرور اتنا نہ کر اے خود نما رنگ طلائی پر — ہے کس روز قلعی آئینہ کی کیمیا تجھ سے
نہیں سیاح سائل تو ہی کچھ اس شاہ خوباں کا
پڑے ہیں شاہ راہ عشق میں لاکھوں گدا تجھ سے

٦١ سنجوگ کے لکھے کی نہ تھی یہ خبر مجھے — آیا نہ راس عشق برہمن پسر مجھے
ہے یاد صبح ہجر کا بجتا گجر مجھے — بھولا نہیں ہے وقت دعائے سحر مجھے
ذکر دہان تنگ ہے گونگے کا مجھکو خواب — یاد کمر میں کچھ نہیں آتا نظر مجھے
کہتا ہے مجھ سے کیا دم رخصت وہ بے وفا — تکلیف دیجئے گا نہ یار دگر مجھے
ہنستا ہے میرے رونے پہ جس دم وہ برق وش — آتی ہے کوندتی ہوئی بجلی نظر مجھے
قید قفس میں رکھے گا صیاد کب تلک — فصل بہار آئی ہے آزاد کر مجھے
بعد فنا بھی ساتھ نہ چھوڑے گا سوز دل — مرقد میں بھی جلائیں گے داغ جگر مجھے

خط میرا چاک چاک کیا اس نے بن پڑھے — بھیجا رسیدِ خط میں سرِ نامہ بر مجھے

ہوں نامور سرائے جہاں میں نگیں کی شکل — قسمت سے ساتھ آیا ہے سونے کا گھر مجھے

لکھتا ہوں وصف اک بتِ شیریں کلام کا — درکار ہے بجائے قلم نیشکر مجھے

سیاح تیز رو ہے مگر کاروانِ عمر
جس کا غبار بھی نہیں آتا نظر مجھے

۶۲

اک پری رو کی محبت کا ہے یہ جوش مجھے — تن بدن تک کا بھی اپنے نہیں کچھ ہوش مجھے

تو بھی کچھ دلولے دکھلا مجھے عہدِ پیری — نوجوانی کا ستاتا تھا غضب جوش مجھے

تنگ ہو ہو کے لگے جھانکنے بغلیں اغیار — دیکھا اس رشکِ پری سے جو ہم آغوش مجھے

مُنہ مرا سونگھتے ہو پی کے خود آئے ہو شراب — نشہ میں آپ ہو اور کہتے ہو بے ہوش مجھے

سُن کے گل بانگ مرے کان گُلوں نے کھولے — دیکھ کر مُرغِ چمن ہو گئے خاموش مجھے

نہیں معلوم کہ غم میں ہے یہ کس مہ رو کے — چرخ دائم نظر آتا ہے سیہ پوش مجھے

بانکپن دیکھ ترا ہو گیا سکتہ مجھ کو — چار آئینہ دکھا ترک زرہ پوش مجھے

عطر کی دیگ کا سرپوش بنا کاسۂ سر — زلفِ مشکیں کے ہے سودے کا یہ اک جوش مجھے

یار سے اتنا تو اثر نالۂ بلبل نے کیا — نظر آتا ہے ہر اک گل ہمہ تن گوش مجھے

کچھ بکھیڑے سے زمانے کے سروکار نہ تھا — خوب عالم تھا وہ جب تک کہ نہ تھا ہوش مجھے

ہم بغل یار سے جب تک ہے غنیمت سیاح
گور سے ہوتا ہے آخر تو ہم آغوش مجھے

۶۳

گلِ نغمہ جو نکلے نہ صدا منقار بلبل سے — عجب کیا گر نکل آوے جو عطر اپنی شمعِ گل سے

بہت تڑپا کیا محبوس ہو کر دستِ قاتل سے — نہ چھوٹا طائرِ رنگِ حنا شاہیں کے چنگل سے

نہ کھولو بال سر کے قد تمہارا حد سے نازک ہے — لچک آجائیگی موئے میاں میں بار کاکل سے

قناعت کیوں نہ نانِ خشک پر ہو مجھکو غربت میں — مہیا نعمتیں دنیا کی ہوتی ہیں توکل سے

دیا ہے جس نے غم سیاح راحت بھی وہی دیگا
ترقی ہوتی ہے دنیا میں کہتے ہیں تنزل سے

۶۴

قتلِ عاشق کا خوں بہا کیا ہے — کشتۂ عشق کی دوا کیا ہے

اب بھی مل جاؤ آہ ہوا کیا ہے — روٹھے پھرتے ہو کیوں بھلا کیا ہے

چلو جانے دو جو ہوا سو ہوا — گزری باتوں کا تذکرہ کیا ہے

کہاں ڈھونڈھے کدھر سے لائے کوئی — دلِ گُم گشتہ کا پتا کیا ہے

اک زمانہ کشیدہ پھرتا ہے — آج کل مجھ سے وہ کھنچا کیا ہے

کوئی پوچھے تو میرے قاتل سے — کہ تجھے اس سے فائدہ کیا ہے

کیوں سسکتا دیا ہے چھوڑ اسے
سچ کہو تیرا مدعا کیا ہے

کیوں نہیں پھیر دیتے ہو صاحب
لیکے دل آپ نے دیا کیا ہے

بے خبر ہوتے ہی موت آپہونچی
اک بہانا ہے اور قضا کیا ہے

جان جاتی ہے عشق میں سیاح
سہل اس کو سمجھ لیا کیا ہے

۶۵ ختم آرایش ہوئی اس خود نما کے واسطے
بھیجتا ہے روز آئینہ جلا کے واسطے

کیوں پریشاں ہو کوئی زلفِ دوتا کے واسطے
ہو گرفتارِ بلا ناحق بلا کے واسطے

کس کے دل پر داغ ہے خاطر ہے مرہم کی تلاش
مشک جو ڈھونڈے نہیں ملتا دوا کے واسطے

دل بھی لیکر ایک بوسہ دے نہیں سکتے ہیں آپ
جان دیتے آشنا ہیں آشنا کے واسطے

درد سہنے کو جو کہتا ہوں تو کہتا ہے وہ بُت
کیجئے مجھ سے نہ یہ باتیں خدا کے واسطے

عشق کے بازار میں رکھا قدم سر بیچ کر
جان پر کھیلے ہیں ہم اُس دلربا کے واسطے

یار گر مانگے گا دل دونگا اُسے میں جان تلک
موت ہے ردِ سوال اہلِ وفا کے واسطے

خاکساری کیمیا ہے گر میسّر ہو تو ہے
تنگ دستی ہے بڑی دولت گدا کے واسطے

تو وہ گل ہے جسکے ممنوں ہیں جوانانِ چمن
کھولی غنچوں نے زباں اپنی ثنا کے واسطے

خاکسار ایسا ہوں میں صحرا میں گر مر جاؤں گا
خاک اڑائیگی صبا مجھ بے نوا کے واسطے

ہجر اس سے کیا ہوا موت آگئی سیاح کو
سچ مثل ہے اک بہانا ہے قضا کے واسطے

۶۶ دلِ وحشی کا بھی کیا کارخانہ لاابالی ہے
زرِ داغِ جنوں کا خرچ ہے سرکار عالی ہے

یہی ہے وقت جانبازی کر اب بسنہ سپر اے دل
چڑھی اک پاے پر قاتل کی بندوقِ دوتالی ہے

نہ رکھنے سرکشی سے تھے زمیں پر جو قدم اپنا
نصیب ان کو بسانِ نقشِ قالیں پائمالی ہے

نصیبوں سے نہ گردِ دل نہ جائے امن ہاتھ آئے
بس اب زیرِ زمیں چلئے سرائے گور خالی ہے

پھرا کرتا ہوں گرد اُسکے نہیں تاب ہم آغوشی
میں ہوں تصویر اور وہ شمع فانوسِ خیالی ہے

لیا اس گل کا اندازِ تبسم صاف غنچہ نے
ہماری طرزِ نالہ مرغِ گلشن نے اُڑائی ہے

جو ہیں دزدانِ مضموں مثل مضموں باندھے جاویں گے
کہ اب سیاح کو شہرِ سخن کی کوتوالی ہے

۶۷ زاہد ہے لاگ کس صنمِ شوخ و شنگ سے
سر پھوڑنے چلا ہے جو کعبہ کے سنگ سے

بے اعتبار نقش و نگارِ زمانہ ہے
ظاہر ہے گردشِ فلکِ ہفت رنگ سے

گردن میں میرے ڈال دیئے اس نے رات ہاتھ
ٹوٹا حجابِ شرم نشہ کے ترنگ سے

اے بُت سر اپنا پھوڑا ہے کس بے گنہ نے رات
جو بہہ رہا ہے خوں ترے جو کوٹ کے سنگ سے

عاشق ہوں ساقیا میگوں ؟ یار کا
چڑھا ہے مدام نشۂ افیون و بھنگ سے

گر دست گیر شوق ہو رہبر ہو جذبِ دل
طے راہِ کوئے یار کروں پائے لنگ سے

زنداں سے آج چھوٹے گا سودائی کونسا
لڑکوں نے جھولیاں ہیں بھری اپنی سنگ سے

جب سے دیا ہے منتِ زہرا جبیں کو دل
رہتا ہے ہم کو ذوق سدا راگ و رنگ سے

دریا دلی سے چاہِ دلِ دشمن میں ہم یکی
ڈرتے نہیں ہیں مردم ؟ نہنگ سے

آمادہ ہوتا ہے وہیں لڑنے کے واسطے
گر لیجیے نامِ صلحِ بت تھا نہ جنگ سے

کرتا ہے صید طائرِ دل ان دلوں وہ ترک
ابرو کماں ہوئے ہیں مژہ ہیں خدنگ سے

زنہار دل نہ دیجیو سیاح تو اسے
صحبت برار ہو گے نہ اس شوخ و شنگ سے

عبث کعبہ کو جاتا ہے خدا نزدیک ہے دل سے
تو کیا نادان ہے زاہد فائدہ تحصیلِ حاصل سے

قفس میں سیرِ گلشن کی اگر مانگے دعا دل سے
صدائے خندۂ گل آئے فریادِ عنادل سے

گنہگاروں کی نکلیں گی نہ تب تک حسرتیں دل سے
قدم بوس آ کے سر ہوگا نہ جب تک پائے قاتل سے

دعا اب یہ نکلتی ہے دہانِ زخمِ بسمل سے
نہ چھوٹے داغِ خوں تا حشر یارب تیغِ قاتل سے

لگی ہے آگ تختے گور کے ہیں پھینک رہے سارے
کفن جل جل کے خاکستر ہوا ہے سوزشِ دل سے

نہ خنجر گلا رکھا ہے خود شوقِ شہادت میں
بھلا کس منہ سے مانگیں خوں بہا ہم اپنے قاتل سے

دعا حلقِ تہ بدہ ہے یہ دوں گر سر جدا ہووے
ہزاروں ایسے ہوں کارِ نمایاں دستِ قاتل سے

نہ رکھیں گے قدم دہشت کے مارے غیر واں ہرگز
نہ گڑوائیں اٹھا کر لاش میری کوئے قاتل سے

جو دیکھا قبلہ رو بتخانہ سمجھے ہم یہ کعبہ ہے
نہ بھولے بت پرستی میں کبھی ہم یادِ خدا دل سے

سر وہی خوں میں ڈوبی گھاٹ تک قاتل کی منزل میں
بہی ندی لہو کی یہ دہانِ زخمِ بسمل سے

سر اپنا سنگِ در سے ہم نے بھی اے کوہکن پھوڑا
مزہ چکھا یہ الفت کر کے اک شیریں شمائل سے

بجائے گرد آتا ہے نظر اک نور کا لپکا
گھٹا ٹوپ اٹھ گیا ہے آج کس لیلیٰ کی محمل سے

اجل غوطے کھلاتی ہے مجھے اس بحر میں جس جا
کمندِ موجِ آفت ہے خجل تھا آشنا ساحل سے

نہ کیونکر فکر غالب ہو مری بزمِ سخن داں میں
تلمذ شاعری میں ہے مجھے استادِ کامل سے

قدم سیاح رکھے جوشِ وحشت سے جو صحرا میں
وحوش و طیر آئیں رقص میں شورِ سلاسل سے

۶۹

اک ترک کی الفت میں پڑے جان کے لالے
اللہ نہ ڈالے کسی بے درد کے پالے

کیا خاک اکیلا میں محبت کو نباہوں
دیکھیں کوئی اک ہاتھ سے تالی تو بجا لے

یوں کہنے کو عاشق سبھی ہوتے ہیں مری جاں
پیدا کہیں ہوتے ہیں بھلا چاہنے والے

برہم ہے مژہ ابروئے قاتل کو ہے جنبش
پڑتی ہے ادھر تیغ ادھر چلتے ہیں بھالے

کس بادشہِ حسن کا ہوں سائلِ دیدار
جو کاسۂ دریوزہ ہیں آنکھوں کے پیالے

دم بھر نظر سیرِ سما واسطے گر ہے ختم
ہیں ساعت ورق گنتے ہیں یہ صاف رسالے

اے سنگ گرت ہم چشمی وہ کیا تجھ سے چمن ایسا
آنکھوں میں پڑے نرگسِ شہلا کے ہیں جالے

دریا ہیں اسیر اشکوں کے بنے وہ کفِ دریا
تھے بالشِ سر ہیں جو مرے روئی کے گالے

دو دن کی ہی وحشت میں لگے تلوے کھجانے
سیاح جنوں نے ترے کیا پاؤں نکالے

درکار خشتِ خم کے سوا تر دہاں نہ تھی
صد شکر مے فروش کی اونچی دکاں نہ تھی

ہوتے حضور تیرے ثنا خواں یہ کیا کریں
قاتل دہانِ زخم کی گویا زباں نہ تھی

زاغ کماں پہ رشک نہ کیوں کھائیں بلبلیں
ٹہنی تھی پھولوں کی تری شاخِ کماں نہ تھی

اک بوسہ مانگا اب تو ملیں گالیاں ہزار
اے بدزباں ترے تو یہ آگے زباں نہ تھی

وحشت کا اپنی ذات سے تا قاف ذکر تھا
تھی بزم کونسی یہ جہاں داستاں نہ تھی

آسودگانِ خاک کہیں گے یہ روزِ حشر
دیکھ آئے جائے امن نہ آسماں نہ تھی

سیاح میرا سینہ تھا گنجینۂ سخن
خاموشی اس قدر کبھی مہرِ دہاں نہ تھی

۷۱ منکر کہاں دنوں جو یار سے گفت و شنید ہے
ہم کو محرم اور رقیبوں کو عید ہے

شاید ہمارے قول پہ حبل الورید ہے
ہم سے خدا قریب ہے کعبہ بعید ہے

گذرا مہ صیام نہ کیوں پیجئے شراب
خالی کا چاند یہ نہیں ہے ماہِ عید ہے

شغل ابتدا یا دہ خواری ہے اور تاک سلسلہ
پیرِ مغاں بھی ایک ہمارا مرید ہے

دل لے چکے ہیں جان بھی اب مانگتے ہیں وہ
بیٹھے ہیں بگڑے اور تقاضا شدید ہے

چل کھول قفلِ آبلۂ پا کے اے جنوں
ہر اک زبانِ خارِ بیاباں کلید ہے

وحشت میں پیرہن کی اڑی دھجیاں تمام
تن پر قبائے داغ ہے سو تو خرید ہے

سنتا ہوں روزِ حشر نہ ہوگی اسے نجات
جو سیدوں سے بغض رکھے وہ یزید ہے

ایسا مزا بھرا ہے طبیعت میں فقر کا
گنجِ شکر ہے سینہ مرا دل فرید ہے

سیاح بے نوا ہوں جہاں گرد ہے لقب
گردش میں چرخِ پیر بھی میرا مرید ہے

۷۲ نہ دیکھے تا کہ کوئی یار یا لائے کفن کھولے
وصیت کر کے مرنا تھا ہمیں اے گورکن کھولے

اگر چشمِ ستم دیکھے تو خوش چشمی ہرن کھولے
جو سونگھے زلف بوئے مشک آہوئے ختن کھولے

عدم کا کیوں کیا ثابت وجود اہلِ سخن کھولے
نہ دیتی تھی عدم کے ساتھ تشبیہِ دہن کھولے

براٸی یار کی کیا اسمیں خوبی ہے نصیبوں کی — کرے جو وعدہ ہم سے اور وہ وعدہ شکن بھولے
سحر گلزار میں خستہ دل اُس درد سے رو یا — کہ اپنا روز کا ہنسنا جوانانِ چمن بھولے
کرے جب قتل مجھ سے سخت جاں کو تب کھلیں جوہر — نہ اپنی قیمچی کی کاٹ پر وہ تیغ زن بھولے

بہت غیروں کو ہم سیاح ٹھہرا رو تڑپاتے ہیں
لیا جب آڑے ہاتھوں ہم نے سارا بانکپن بھولے

۷۳ زمانہ مست ہے دورِ شرابِ ارغوانی ہے — ہمارے وقت کا ہر مغبچہ جمشیدِ ثانی ہے
یہ کیسی طالبِ دیدار پر نامہربانی ہے — جواب اس کا خدایا کیا یہی اک لن ترانی ہے
ہنسے وہ نوجواں کیونکر نہ میرے ضعفِ پیری پر — ابھی زوروں کے دن ہیں ابتدائے نوجوانی ہے
تصدق کر اُسے بوٹے سے قد پر شوق سے اے گل — ترا بندہ ہے جس کا نام سروِ بوستانی ہے
گردوں خود عزم کیا ملک بقا کو دارِ فانی سے — وہیں لیجائیگی قسمت جہاں کا دانہ پانی ہے
ہوا دنیا کی کھاتی ہے غنیمت صبح پیری میں — ق — کوئی دن کو ہمارا گل چراغِ زندگانی ہے
حساب اس کی نہیں نیکی بدی کا اپنے کچھ ذمے — خراج اس پر نہیں ویرانہ یہ دنیائے فانی ہے

تڑپتا ہے دلِ سیاح مچھلی کی طرح اس میں
مرا سینہ بھی گویا برجِ حوت آسمانی ہے

۷۴ صبا ملبوس نوروزی جو امسال ارغوانی ہے — گلی میں طفلِ غنچے کی قبا کیا ہی سہانی ہے
نہ گھبرا تجھ سے بے پروا وہ ہوگا ہمکلام اک دن — دلا تکیہ کلام اس خود نما کا لن ترانی ہے
زباں کٹراتی ہے شرحِ غمِ عشقِ پریکار دیاں — حریرِ خامۂ جادو رقم کی یہ زبانی ہے
بچھاتا خارِ غم ہے وہاں جہاں بستر لگاتا ہوں — کھٹکتی میری دو دن کی فلک کو زندگانی ہے
چڑھا کر ایک پاٹی پر جو رہ جاتا ہے اے قاتل — مری پستول کی کیا جانب میں ٹوٹی کمانی ہے
کھلے ہیں داغِ سودا تن پہ مثلِ لالۂ صحرا — غضب اے دشتیو فصلِ جنوں کی رُت سہانی ہے

امید و بیم کے جھگڑے سے ہوں سیاح بے پروا
سرائے گور سے بدتر مجھے دنیائے فانی ہے

۷۵ کام اپنا کیا آخر یہ موت بھی کیا شئے تھی — کہنے کو نگہباں تھی پر جان کے درپے تھی
شب بھیس بدل کر ہم گھر میں جو گئے اُسکے — غل تھا کہ یہ کون آیا فریاد تھی ہے ہے تھی
چلمن سے ہٹا یا مُنہ دکھلا کے جھگڑے کو — بجلی تھی چھلاوا تھا کیا جانے یہ کیا شئے تھی
خوبانِ چمن نے گل کھیلے تھے مگر بھولے — ہر نالۂ بلبل میں آوازِ دف و نے تھی
ذکر ان کا تھا مستی میں اپنے تھے جو ہم مشرب — ہر جام کے پیتے میں شب بادۂ جم کے تھی
کونین کی نعمت سے دونا تھا مزا حاصل — شب عیش دوبالا تھا دلدار تھا اور مے تھی
لو روح ہوئی تن سے سیاح جدا آخر — مدت سے قضا اسکی بربادی کی درپے تھی

۷۶

نذرانے پہلے خدمتِ درباں میں رکھ لئے — پیچھے کہیں قدم درِ جاناں میں رکھ لئے

اللہ رے بدگمانی کہ بٹھائے جدا جدا — اک جا نہ دو اسیر بھی زنداں میں رکھ لئے

عاشق سے کیا کلام کرے اوستاد از — سی پارے دل کے لیکے دبستاں میں رکھ لئے

بندے ہیں کس کے مصحفِ رخ کے جو خلق نے — لڑکوں کے نام دیکھ کے قرآں میں رکھ لئے

شوقِ رخِ صنم میں کئے مصحف مجید — آنکھوں کے سامنے شبِ ہجراں میں رکھ لئے

اب کیا کریں کہ خرقہ و سجادہ و ردا — سب رہن مے فروش کی دکاں میں رکھ لئے

جب گو تری قفل گو تجی کہ چوٹی تو لا کہ دل — قیدی بنا کے کاکلِ پیچاں میں رکھ لئے

چلائے سینکڑوں لپس محمل خرس نمط — بے درد نے نہ ذیل حدی خواں میں رکھ لئے

لکھتے کے وقت بھی نہ پڑھے کھول کر کبھی
سیاح کے خطوط قلمداں میں رکھ لئے

۷۷

یار نے اچھی دوا کی اس دلِ بیمار کی — مشک چھڑکا بدلی پٹی مرہم زنگار کی

کھل گئی جس دم گرہ موہائے جعدِ یار کی — مغز جاں میں بھر گئی بو نافۂ تاتار کی

آمد آمد نزع نے مسکن پائی جس دم یار کی — پھر گئی آئی ہوئی شب کو قضا بیمار کی

کیا عجب گر پان کھاتے وقت گردن یار کی — صاف بن جائے صراحی بادۂ گلنار کی

ہوں میں وہ صحرائے وحشت کا درختِ خاردار — دھجیاں جس نے اڑائیں دامنِ کہسار کی

ہے تصور میں خیالِ روئے جاناں جلوہ گر — خواب میں دیکھیں گے صورت طالعِ بیدار کی

مردنی منہ پر مریض کے اس طرح چھائی ہے کہ بس — موت بھی ڈرتی ہے صورت سے ترے بیمار کی

کفر سے ہے میری دیں داری کا سارا بندوبست — تارِ سبحہ سے ملی ہے لو مری زنار کی

پڑ گیا ہے اسکو چسکا چاٹ کر کس کا لہو — انگلی ہی پڑتی ہے جو تلوار اس خونخوار کی

بسملوں کے خوں کی قاتل دیکھ گل کاری ذرا — بن گئی ہے شاخِ گل کا نٹی تری تلوار کی

محتسب بیٹھا ہے در پر ڈر نہیں بیٹھا رہے — میکشو دیوار پھاندو خانۂ خمار کی

نرگسِ بیمارِ ساقی سے چھٹی کیا میکشی — کہتے ہیں پرہیز جس کو جڑ ہے اس بیمار کی

تارِ گیسو سے ہمارے زخمِ دل ٹانکے تھے کیا — ہے لہو اور پیپ میں بو نافۂ تاتار کی

نام لے میرے دلِ سوزاں کے کھانے کا اگر — جل کے خاکستر زباں ہو مرغِ آتش خوار کی

یاد کس کے ہے دُرِ دنداں کی اے سیاح آج
سلکِ گوہر جو لڑی آنسوؤں کے تار کی

۷۸

پیام یار کے پھر ہم کو بار بار آئے — خدا کی شان کہ پھر قاصد آئے یار آئے

ڈرے ہیں دیکھ کے شب مجھکو خواب میں شاید — کہ میرے پاس سحر کہہ کے وہ بے قرار آئے

کیا جو وعدہ کبھی ہم سے تو وفا بھی کیا — تمہاری بات کا کیونکر نہ اعتبار آئے

تصورِ خندِ جاناں ہے مجھکو مکتب میں — الف الف ہے نہ کیوں لب پہ بار بار آئے
قیامت آئے گی مُرغِ اسیر پر ناحق — خدا کرے نہ کبھی موسمِ بہار آئے
وہ برگِ سبز سمجھتے ہیں تحفۂ دلکش — جو پان بھیجے تو پھولوں کے ڈال سے ہار آئے
تصورِ دہنِ تنگ ہے مجھے دمِ فکر — یقیں ہے مُنہ میں نہ کچھ بات زینہار آئے
بلا سے ہوگی ذرا تشنگیٔ دید تو رفع — اگر لئے ہوئے وہ تیغِ آبدار آئے
کسی کے ساتھ وہاں گھر کو میں نہ جاؤں گا — الٰہی لینے کو میرے وہی نگار آئے
یہ جذبِ شوق ہے میرا کہ بعدِ مُردن وہ — گلِ آنسوؤں کے چڑھانے سرِ مزار آئے
کیا قبول کہ مانی شبیہ کھینچے گا — مگر نظر سرِ مو بھی میانِ یار آئے
گیا نہیں پسِ مُردن بھی گیسوؤں کا خیال — عذابِ قبر میں دیتے مجھے یہ مار آئے
لڑا کے آنکھ اُڑا لے گئے پری دل کو
عجیب معرکہ سیاحؔ آج مار آئے

٦٩

سردی کے دلوں میں ہے تنِ زار میں گرمی — گرمی سے بھری ہے دلِ بیمار میں گرمی
آتش قدم ایسا ہوں جو ٹھیروں تو زیادہ — ہو دھوپ سے بھی سایۂ دیوار میں گرمی
جلتا ہے شبِ ماہ میں پے شمعِ رخِ یار — ایسی تو کبھی تھی نہ شبِ تار میں گرمی
جاتی رہی سب حُسن کے جاتے ہی شرارت — مطلق نہ رہی نام کو بھی یار میں گرمی
ہوں سرد تپِ لرزہ سے چھاتی سے لپٹ جا — آ جائے نہ پھر سر سے تنِ زار میں گرمی
تھی کون سے دل سوختہ کی آہِ شرر بار — شب کو جو ہوئی انجمنِ یار میں گرمی
شبنم نہیں غنچوں سے نکلتا ہے پسینہ — ہے نالۂ بلبل سے یہ گلزار میں گرمی
اللہ رے شرارت تری اللہ رے شرارت — انداز میں رفتار میں گفتار میں گرمی
بالوں میں نکلتا ہے دھواں سردی میں مُنہ سے — دل جلتا ہے ایسا ہے تنِ زار میں گرمی
لعلِ لبِ جاناں کا ہے سرگرم خریدار — ہے آتشِ یاقوت سے بازار میں گرمی
سوزش نہ گئی دل کی ابھی سیاحؔ پسِ مرگ
اب تک ہے مری خاکِ تنِ زار میں گرمی

٧٠

بے حجابی ہے بہت شرم نہیں تھوڑی سی — تجھ میں بد خو ہے ابھی طفلِ حسیں تھوڑی سی
بت پرستی سے تو بدنام ہوں دنیا میں بہت — کلمہ گوئی سے ہے ابھی حرمتِ دیں تھوڑی سی
خاکساری کا ہوں پابند بڑی دولت ہے — ہاتھ میں آئے گی اکسیر کہیں تھوڑی سی
خاک میں جب سے ملا ہوں ہیں گراں بار ابھی چرخ — جھک گئی ہے کمرِ گاؤ زمیں تھوڑی سی
منہ چڑھاتے ہو جواب کرتے ہو بوسہ کا سوال — باقی اک گالیاں دینی ہی رہیں تھوڑی سی
نام روشن ہوئے شاہانِ جہاں کے لیکن — رو سیاہی بھی ہے مانندِ نگیں تھوڑی سی

وصل کا کرتے ہیں اقرار کبھی وہ انکار
ساتھ ہاں کے چلی جاتی ہے نہیں تھوڑی سی

بو نہ رہے زلف کی سی عنبر سارا ہیں نہیں
رکھتا بو باس ہے ہاں نافۂ چیں تھوڑی سی

تیز رد جیتنے تھے سب بیٹھ گئے تھک تھک کر
نہ ہوئی طے رہِ الفت کی زمیں تھوڑی سی

پرزے نامہ کے ہوئے سر پر ہے قاصد کا قلم
تھی نصیبوں میں جو ایذائیں لکھیں تھوڑی سی

قدر دانوں کے ستائے کو بہت ہیں سیاح
کیا ہوا بنیں جواب کے یہ لکھیں تھوڑی سی

۸۱ دل کی بے تابی کو کب تک اجی دیکھا کیجے
شکوۂ چشم نہ کیجے تو بھلا کیا کیجے

آئیے آپ و یا مجھ کو بلا یا کیجے
ورنہ اس چاہ سے بہتر ہے کنارا کیجے

کون کمبخت یہ کہتا ہے کہ آیا کیجے
دو زنِ در تو صنم بہر خدا وا کیجے

ہے کشش پیچ یہ الفت میں بتوں کی اے دل
چلیے کعبہ کو یا قصد کلیسا کیجے

نکلی گل گرمیٔ صحبت سے وہ گھبراتے ہیں
رات جاتی ہے کٹی وصل کی کیسا کیجے

لب نہ وا ہوں تو دکھا دیجیے اعجازِ نگاہ
دلِ مردہ کو اشاروں سے ہی زندہ کیجے

زندگی میں بہت عیش اٹھائے سیاح
اب مناسب ہے کہ فکرِ رہِ عقبیٰ کیجے

۸۲ وصالِ یار میں ہوتا بحال کیسا ہے
شبِ فراق میں یہ جی نڈھال کیسا ہے

ہزار مرتبہ بھر بھر کے پھوٹ جاتا ہے
یہ زخم دل کا مرے اندمال کیسا ہے

قلم کو تاب ہے اسکی نہ خط میں گنجائش
میں کیا کہوں مجھے قاصد ملال کیسا ہے

ممانعت ہے کہ شکوہ کرے نہ کوئی فغاں
ہوا یہ دشمنِ جاں کو زوال کیسا ہے

جو تم کو آنا ہے آؤ نہیں تو جاتی ہے جاں
یہ روز مرہ جواب و سوال کیسا ہے

بنا کے چھوڑ رہے ہیں چہرہ پہ زلفیں دل لینے
فریب کیسا یہ پھیلا یا جال کیسا ہے

پھڑک پھڑک کے گئی مرغِ دل کی جاں نہیں
یہ عشق گیسوئے دلربا کا جال کیسا ہے

ہر ایک دل اسی فانوس کا ہے پروانہ
یہ نیلے پردہ میں صاحب جمال کیسا ہے

بتوں کے عشق میں سجدہ بھلا دیا اس کا
گناہ گار مرا بال بال کیسا ہے

یہ کون بات تھی کیا خط میں تھی نہ گنجائش
لفافہ پر یہ لکھا عرضِ حال کیسا ہے

بہار آتی ہے مجھ کو جنوں کا جوش ہوا
یہ فصل کیسی ہے یہ اعتدال کیسا ہے

جہان بھر میں وہ کرتے ہیں میری رسوائی
اور اس پہ کہتے ہیں تم کو ملال کیسا ہے

کسی کی بات وہ سنتا نہیں ہے اے سیاح
دکھاؤں کس کو مرے دل کا حال کیسا ہے

۸۳ قید میں میں نے کئے نقصان یہ صیاد کے
جال پھاڑے سینکڑوں توڑے قفس فولاد کے

بلبلِ نالاں نے جب توڑے قفس فولاد کے
دیکھ کر ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے صیاد کے

بل اُٹھائے ہیں صدا زلفِ ستم ایجاد کے
چال ہم نے ایسے دیکھے ہیں بہت صیاد کے

گر اسی صورت رہے گی بلبلِ گرمِ فغاں
آگ لگ جائیگی گھر میں ایک دن صیاد کے

کھول دیں قسمت سے بلبل کے قفس کی تیلیاں
ایسے کچھ آنکھوں پہ پردے پڑ گئے صیاد کے

پڑ گئے منقار موسیقار میں بھی آبلے
نقل کرتے ہیں تانے نالہ و فریاد کے

اختلافات و تصحیحات

غزل نمبر	شعر نمبر	مصرعہ	اصل	تصحیح	غزل نمبر	شعر نمبر	مصرعہ	اصل	تصحیح
۱	۱	اولیٰ	بتری	تیری	۴۰	مقطع	-	بعد لطف سیاحت	بعد مرگ سیاحت
۱	۲	اولیٰ	تری	تیری	۴۴	۱	اولیٰ	-	کیا
۱	۹	اولیٰ	نری	تیری	۴۳	۲	اولیٰ	یک	ایک
۱	۹	ثانی	شکر	شکوہ	۴۵	۷	ثانی	کو	سے
۲	۲	ثانی	ترے	تیرے	۴۵	۱۲	ثانی	مورے	میرے
۲	۵	اولیٰ	خالی جگہ ہے		۴۶	۱	ثانی	میرے رہا	مرے رنگ
۱۳	۴	ثانی	(ہے) نہیں ہے	ہے	۴۶	۱۴	ثانی	تا گمیں	تا گئی
۱۴	۱	اولیٰ	تم سے	تم سا	۴۷	۸	اولیٰ	کیفقت	کیفیت
۱۵	۳	اولیٰ	گاتی ہیں	گاتی ہے	۴۷	۹	ثانی	بل	بالی
۱۸	۲	اولیٰ	دہ مان	دامان	۵۰	۴	اولیٰ	ٹھرے بتوری کو	ٹھہرے تیوری کو
۱۹	۱۱	اولیٰ	ترے	تیرے	۵۴	۵	ثانی	صورت	سورت
۱۹	۱۳	ثانی	نالو	نالوں	۵۹	۲	ثانی	چراتا ہے	چڑھ جاتا ہے
۲۳	۳	ثانی	معدم	معدوم	۶۵	۷	ثانی	-	وفا
۲۴	۸	ثانی	مونگری	موگری	۶۷	۸	اولیٰ	-	ہے
۲۷	۲	ثانی	رزگر	زرگر	۶۸	۵	اولیٰ	تخنہ	تختے
۲۸	مقطع	حاشیہ میں لکھا ہوا تھا جو جلد بندی میں کٹ گیا ہے			۶۹	۳	ثانی	-	ہیں
۲۹	۱	اولیٰ	جگہ خالی ہے	یہ	۷۳	۳	ثانی	زرد و نکلے	زرد رو نکلے
۲۹	۵	اولیٰ	کھنچا	کھچا	۷۴	۴	اس غزل پر مقطع استاد لکھا ہوا ہے۔		
۳۱	۳	ثانی	میرے	مرے	۷۷	مقطع	ثانی	تار تار	تار
۳۳	۱	-	حاشیہ میں کٹ گیا ہے۔		۷۸	-	اس غزل پر لفظ آگرہ لکھا ہوا ہے۔		
۳۸	۵	ثانی	دبشی	دہش	۷۹	-	اس غزل کے پہلے دو شعروں کے ساتھ استاد لکھا ہوا ہے۔		

سیاح کے مجموعۂ کلام میں بعض غزلیں ایسی ہیں جن کا ذکر خطوطِ غالب میں ملتا ہے۔ چند غزلیں ایسی بھی ہیں

جن سے زمان و مکان قیاس کئے جا سکتے ہیں۔ ذیل میں ایسی غزلوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس جگہ غزلوں کے نمبر درج کئے جاتے ہیں۔ غزلیں متن میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) غزل نمبر (۸) مقطع میں "آن تان" استعمال کیا گیا ہے۔ سیاح نے غالب سے اس محاورہ کے متعلق دریافت کیا تھا۔ غالب نے اپنے ایک خط میں اس کے استعمال پر روشنی ڈالی ہے اور "آن تان" کو "آن بان" پر ترجیح دی ہے۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ غزل سفر بنارس کے دوران میں لکھی گئی ہوگی۔ دیکھئے ضمیمہ خط نمبر

(۲) نمبر (۱۵) یہ سہرا ۱۸۶۳ء میں میر ابراہیم علی خاں وفا شاگرد غالب کے بچے کی رسم بسم اللہ کے موقع پر لکھا گیا تھا۔ غلام بابا خاں اس تقریب میں بمقام بڑودہ شریک ہوئے تھے۔ سیاح بھی ساتھ گئے ہوں گے دیکھئے تکملہ

(۳) غزل نمبر (۲۱) آخری دو شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ کے سفر کے دوران میں لکھی گئی ہے۔ دیکھئے ضمیمہ خط نمبر

(۴) غزل نمبر (۲۵) لکھنؤ میں لکھی گئی ہے منظور سورتی نے بھی اسی زمین میں غزل کہی ہے جس میں ان کے وطن لوٹنے کی طرف اشارہ ہے۔

(۵) غزل نمبر (۳۷)۔ لفظ غربال استعمال کیا گیا ہے۔ سیاح نے غالب سے اس کے متعلق استفسار کیا تھا۔ غالب نے اپنے خط میں اس لفظ پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ غزل بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیام لکھنؤ یعنی ۱۸۶۱ء میں لکھی گئی ہے۔ دیکھئے ضمیمہ خط نمبر

(۶) غزل نمبر (۳۸)۔ مقطع میں پورا نام ہے۔ غالب ۱۲ فروری ۱۸۶۱ء کے خط میں لکھتے ہیں "جس بحر میں کوئی اسم یا لفظ نہ آسکے اس کی تدبیر فردوسی و خاقانی سے بھی نہ ہوگی میں کیا کروں گا۔ نام تمہارا آسکتا ہے۔ لیکن الف دبتا دبتا ہے۔ تمہارے واسطے اس کی تدبیر میر صاحب سے ضرور پوچھنا" یہ غزل بھی لکھنؤ میں لکھی گئی ہے۔ دیکھئے ضمیمہ خط نمبر

(۷) غزل نمبر (۴۶) اس کے مقطع سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں یہ غزل کہی ہے۔

(۸) غزل نمبر (۶۱) سورت کے شاعر شیخ لعل شاہ گرنلیا کی غزل پر غزل کہی ہے۔

(۹) غزل نمبر (۴۷) اس غزل کے چوتھے شعر پر اصل نسخے میں صاد کیا ہوا ہے اور لفظ استاد بھی لکھا ہوا ہے۔

(۱۰) غزل نمبر (۷۸) مشاعرہ آگرہ کی غزل ہے۔ سیر سیاح میں یہ شامل ہے۔

(۱۱) غزل نمبر (۷۹) اصل نسخے میں اس غزل پر صاد کیا ہوا ہے اور لفظ استاد بھی لکھا ہوا ہے۔

(۱۲) غزل نمبر (۸۱) مقطع سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخری زمانے کی غزل ہے۔

ضمیمہ نمبر ۱

۱۔ بنام نواب میر غلام بابا خاں بہادر

سبحان اللہ تعالیٰ شانہٗ و اعظم برہانہٗ۔ جناب مستطاب نواب میر غلام بابا خاں بہادر سے بتوسط میاں داد خاں صاحب شناسائی بہم پہنچی لیکن واہ اول ساغر دُردی کیا جگر خون کن اتفاق ہے۔ پہلا عنایت نامہ جو حضرت کا مجھ کو آیا اس میں خبر مرگ۔ اب میں جو اس کا جواب لکھوں اور یہ میرا پہلا خط ہوگا۔ لامحالہ مضامین اندوہ انگیز ہوں گے۔ نہ نامۂ شوق نہ محبت نامہ صرف تعزیت نامہ صریر قلم صاحبین کے شیون کا خروش ہے۔ جو لفظ نکلا وہ سیاہ پوش ہے۔ ہے ہے۔ نواب میر جعفر علی خاں جیسا امیر۔ روشن گہر۔ نام آور۔ روشناس اعیان ہند و انگلستان وسط جوانی یعنی ۴۶ برس کی عمر میں یوں مر جائے ؎

نخلِ چمنِ سروری افتاد ز پا ہائے

سچ تو یوں ہے کہ یہ دہر آشوب غم ہے۔ مجموع اہل ہند ماتم دار و سوگوار ہوں تو بھی کم ہے۔ اگرچہ میں کیا اور میری دعا کیا۔ مگر اس کے سوا مغفرت کی دعا کروں اور کیا کروں۔ قطعہ سالِ رحلت نواب غفران مآب جب دل خار خار غم سے پُرخوں ہوا ہے یوں موزوں ہوا ہے ؎

گردید نہاں مہر جہانتاب دریغ — شد تیرہ جہاں بچشم احباب دریغ
این واقعہ را از رہ بے زاری غالب — تاریخ رقم کرد کہ "نواب دریغ"

از روئے زاری ز آہ ہوتز کے عدد بڑھائے جائیں تو ۱۲۸۰ھ پیدا ہوتے ہیں۔ فہذا المطلوب شریک بزم ماتم منشی میاں داد خاں صاحب کو سلام۔ یکشنبہ بست دیکم ربیع الاول ۱۲۸۰ھ مطابق ششم ستمبر ۱۸۶۳ء۔

۲۔ نواب صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان نواب میر غلام بابا خاں صاحب بہادر زادہ مجدہٗ عرض کیا جاتا ہے کہ آپ کا عنایت نامہ اور مولانا سیف الحق کا مہربانی نامہ دونوں لفافے ایک دن پہنچے سیف الحق کے خط سے معلوم ہوا کہ رجب کے مہینے میں شادیاں قرار پائی ہیں۔ مبارک ہو اور مبارک ہو۔ نظارہ بزم جمشیدی سے محروم رہوں گا مگر میرا حصہ مجھ کو پہنچ رہے گا۔ خاطر جمع ہے۔ کیوں حضرت صاحبزادہ کا اسم تاریخی پسند آگیا یا نہیں۔ نام تاریخی الوہم سید بھی اور خان بھی۔ سید مہابت علی خاں۔ عجب ہے۔ اگر پسند نہ آئے اور بہت عجب ہے کہ اس امر کی نہ آپ کے خط میں توضیح نہ میاں داد خاں کے خط میں۔ خیر۔ یہ میں نہیں کہتا کہ خواہی نہ خواہی یہی نام رکھیے۔

پسند آئے نہ آئے کی تو فقیر کو اطلاع ہو جائے۔ جواب کا طالب غالب۔ ۹۔ ماہ اگست ۱۸۶۶ء عیسوی۔

۴۳۔ ستودہ بہر آیان دنا مور بہر دیار نواب صاحب شفیق کرم گستر مرتضوی تبار نواب میر غلام بابا خان بہادر کو مسرت بصد مسرت وجشن مبارک وہمایوں ہو۔ رقعہ گلگوں نے بہار کی سیر دکھلائی۔ بسواری ریل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج۔ کانوں سے بہرا۔ ضعفِ بصارت ضعفِ دماغ ضعفِ دل۔ ضعفِ معدہ۔ ان سب ضعفوں پر ضعفِ طالع۔ کیونکر قصدِ سفر کروں۔ تین چار شبانہ روز نفس میں کس طرح بسر کروں۔ گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ناگاہ قولنج کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں۔ حالت جان میں نہیں۔ آنا میرا سورت تک کسی صورت حیّز امکان میں نہیں۔ خط لکھتے لکھتے خیال میں آیا کہ سید صاحب کی ولادت کی تاریخ لکھی۔ سیدانی صاحبہ کی بسم اللہ کی بھی تاریخ لکھا چاہیئے۔ مادۂ خجستہ بہار۔ ذہن میں آیا سات عدد کم پائے۔ خجستہ بہار پر ادب کے اعداد بڑھائے شمار میں ۱۲۸۳ نظر آئے۔ دوسرے ورق پر وہ قطعہ مرقوم ہے۔ بوڑھوں کی فکر کی طاقت معلوم ہے۔ صرف جوشِ محبت سے چار مصرع موزوں ہوئے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ راقم اسد اللہ خاں غالب۔ ۱۴۔ نومبر ۱۸۶۶ء۔ سیف الحق صاحب کو سلام۔ ایک میرے دوست مصور خاکسار کا خاکہ اُتارنے کو اکبر آباد گئے ہیں وہ آجائیں تو شغلِ تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے۔ خط از راہِ احتیاط بیرنگ بھیجا ہے۔ قطعہ۔

خجستہ جشن دبستان نشینی بیگم — بفیضِ ہمت نواب و یمن و اقبالش
چو از پئے ادب آموزیست خوش باشد — "اگر خجستہ بہار ادب بود سالش"

۴۔ منشی میاں داد خاں سیاح

برخوردار کامگار سعادت نشان منشی میاں داد خاں سیاح طال عمرہٗ۔ درویش گوشہ نشین غالبِ حزیں کی دعائے درویشانہ سے کامیاب و بہرہ مند ہوں۔ لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے مگر تم کو یاد رہے کہ وہاں بعد اس فساد کے ایک کون ہوگا یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی بازار اچھے نکل آئیں گے جو دیکھے گا داد دے گا اور دلی کے فساد کے بعد کون نہیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سوائے اس بازار کے جو قلعہ کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک ہے سراسر بگڑ گئی ہے اور بگڑتی جاتی ہے۔ دیوان کا چھاپا کیسا وہ شخص نا آشنا موسوم عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا آدمی نہیں ہے بھوت ہے۔ پلید ہے غول ہے۔ قصہ مختصر سخت نا معقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور ید الطباع دیوان نا مطبوع ہے اب میں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آجائے۔ تم بھی دعا مانگو۔ زیادہ کیا لکھوں۔ دوشنبہ ۱۱ جون ۱۸۶۰ء۔ غالب۔

۵۔ برخوردار۔ تمہارا خط پہنچا۔ لکھنؤ کا کیا کہنا ہے وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ۔ وہ سرکار امیر گر تھی۔ جو بے سرو پا وہاں پہونچا امیر بن گیا۔ اس باغ کی یہ فصلِ خزاں ہے۔ میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان غاصبِ نا انصاف سے ہاتھ آ گیا اور میں نے نورچشم منشی شیو نراین کو بھیج دیا۔ یقینِ کُلّی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہو گے ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔ طریقۂ سعادت مندان یہ ہے کہ ہم کو اپنی خیر و عافیت کا طالب جان کر جہاں جاؤ وہاں سے خط لکھتے رہو اور اپنے مسکن کا پتہ ہم پر ظاہر کرتے رہو۔ ہم تم سے راضی ہیں اور چونکہ تمہاری خدمت اچھی طرح نہیں کی شرمندہ بھی ہیں۔ راقم اسد اللہ خاں۔ مرقومۂ شنبہ۔ روز عید۔ مطابق ۳۰۔ جون سنہ ۱۸۶۰ عیسوی۔

۶۔ سعادت و اقبال نشان منشی میاں داد خاں سے میں بہت شرمندہ ہوں کہ ان کے خطوط کا جواب نہیں لکھا۔ غزلوں کے مسودے گُم ہو گئے۔ اس شرمندگی سے پاسخ نگار نہ ہوا۔ اب یہ سطریں جو لکھتا ہوں اس خط کے جواب میں ہیں جو بنارس سے آیا ہے۔ بھائی بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے۔ ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور چراغِ دیر اس کا نام رکھا ہے۔ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے اس کو دیکھنا۔ اشرف حسین خاں صاحب میرے دوست ہیں۔ فتنہ و فساد کے زمانے سے بہت پہلے ان کا خط اور کچھ ان کا کلام میرے پاس آیا ہے۔ تم ان کو میرا سلام کہنا اور میں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگذشت لکھی ہے اسی طرح آئندہ بھی لکھتے رہو گے۔ میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں ؎

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ در نظر گذرد
زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

خیر، اگر سیر و سیاحت میسر نہیں نہ سہی، ذکر العیش نصف العیش پر قناعت کی۔ میاں داد خاں سیاح کی سرگذشتِ سیر و سفر ہی نہ سُنی۔ غزل تمہاری رہنے دیتا ہوں۔ اس کے دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ جیسا تم نے وعدہ کیا ہے جب اور غزلیں بھیجو گے ان کے ساتھ اس کو بھی دیکھ لوں گا۔ بلکہ احتیاط مقتضی اس کا ہے کہ ان غزلوں کے ساتھ اس غزل کو بھی لکھ بھیجنا۔ ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکمّا کر دیا ہے۔ ضعف۔ سُستی۔ کاہلی۔ گراں جانی۔ گرانی۔ رکاب میں پانوں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دُور دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر۔ اگر باز پُرس ہوئی تو سقر (دوزخ) مقر (ٹھکانا) ہے اور ہاویہ (طبقۂ دوزخ) زاویہ (گوشہ) ہے۔ دوزخِ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اللہ اللہ۔ نجات کا طالب غالب۔ صبح دوشنبہ۔ ۳۱۔ دسمبر سنہ ۱۸۶۰ء۔

۷۔ آئیے میرے مولانا سیاح۔ سلامٌ علیکم۔ مزاج مبارک۔ سورت کا پہنچنا بہرصورت مبارک ہو۔ بھائی میرا دل بہت خوش ہوا کہ تم اپنے وطن پہنچے۔ لیکن تم کو چین کہاں۔ خدا جانے کئے ہفتے یا کئے

مہینے ٹھہرے گئے۔ اور پھر سیاحت کو نکلو گے۔ جی میں کہو گے آؤ اب دکن کی سیر کریں۔ حیدر آباد۔ اورنگ آباد
دولت آباد اچھے ہیں۔ ان کو دیکھیں۔ مرزا معین الدین حسین خاں اور مرزا محمد حسین خاں یہ دونوں بیٹے
ہیں نواب قدرت اللہ بیگ خاں کے اور قدرت اللہ بیگ خاں ابن عم تھے نواب احمد بخش خاں کے
اور معین الدین حسین خاں کی بہن منسوب ہے بھائی ضیاء الدین خاں سے۔ یہاں کوئی امر نیا نہیں واقع ہوا۔
وہی حالات و اطوار ہیں جو دیکھ گئے ہو۔ مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں۔ وہاں سے ان کے
جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگزار کا حکم آئے اور وہ مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرہ بیٹھا ہوا ہے اور
کوئی جانے نہیں پاتا۔ والسلام مع الاکرام۔ صبح سہ شنبہ۔ ۲۔ ذیقعدہ ومنہ فقط۔ غالب۔

۸۔ سعادت و اقبال نشان سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔
خط میں آپ نے بہت سے مطالب لکھے مگر تین کتابوں کی دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی۔ یہ ایک پارسل جو
بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے اس میں وہی لطائف غیبی ہے جس کو میں نے اپنے مطالعہ میں رکھ کر صحیح کیا
ہے۔ اس کے بھیجنے سے یہ مدعا کہ تم ان تینوں رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو۔ اگر چھوٹے صاحب نے رکھ لیا
ہے تو ان سے مستعار لے کر اپنی سب کتابیں صحیح کر لو۔ اور وہ نسخہ ان کے نذر کر دو۔ صاحب میں نے اپنے
صرف زر سے لطائف غیبی کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپی ہیں۔ بیس میں نے مول لیں۔
میں تم کو دلوا دیں۔ بیس بھائی ضیاء الدین نے لیں۔ دس مصطفیٰ خاں صاحب نے لیں۔ باقی کا حال مجھے
معلوم نہیں۔ دیکھو سیف الحق۔ شیخ سعدی کا قول کیا سچا ہے ؎

اگر دنیا نباشد دردمندیم ۔۔۔ وگر باشد بمہرش پائے بندیم
بلائے زیں جہاں آشوب تر نیست ۔۔۔ کہ رنج خاطر ست ار ہست ور نیست

جہاں دولت نہیں وہاں مصیبت ہے۔ جہاں دولت ہے وہاں خصومت ہے۔ میں تو میر غلام بابا خاں کا
دوست ہوں۔ ان کی دعا مانگتا ہوں۔ آپ اتنی مہربانی کریں کہ یہ حالات جو واقع ہوا کریں وہ مجھ کو لکھا کریں۔
غربیلہ کی ہندی تخرہ ہے۔ فارسی میں غربیلہ لو لیتے ہیں۔ نجات کا طالب غالب۔ پنجم شعبان ۱۲۸۱ھ۔

۹۔ منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی میاں داد خاں سیاح سیف الحق سلمکم اللہ تعالیٰ۔
دعا اور سلام اور شکر اور سپاس۔ تمہارا خط مرقومہ ۳۰۔ اگست پرسوں بروز جمعہ ۸۔ ستمبر ۱۸۶۵ء کو پہنچا۔
کل دسویں ستمبر ماہ حال کو سو روپے مندرجہ اس کے ایک صراف سے وصول ہو گئے۔ چھوٹے صاحب نے بڑی
جوانمردی اور بڑی ہمت کی۔ اس صرف میں میرا کام ہوا اور ان کا نام ہوا۔ اللہ اللہ اب بھی ہندوستان میں
ایسے لوگ ہیں کہ نہ میں نے ان کو دیکھا نہ انھوں نے مجھ کو دیکھا۔ نہ میرا کوئی حق ان پر ثابت۔ نہ ان کو کوئی خدمت
مجھ سے لینی منظور۔ خیر، فقیر ہوں جب تک جیوں گا دعا دوں گا۔ تمام عمر ممنون اور شرمندہ رہوں گا۔
تمہارا بھی احسان مانوں گا۔ اب دو ایک دن میں کاغذ آ جائے تو اس کا انطباع شروع ہو جائے۔ تم نواب صاحب کو
میرا سلام کہو اور یہ خط دکھا دو اور عرض کرو کہ آج تک کسی بھائی یا کسی دوست کا روپے پیسے کا احسان مند
نہیں ہوا تھا، اب احسان بھی اٹھایا تو اپنے آقا یعنی علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فرزند کا۔ وہ جو ایک اور کتاب کا

تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملانے مکتب دار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ اس کا نام۔ میرٹھ کا رہنے والا کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریریں میں نے دیکھی تم کو بھی بھیجوں گا۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو لطائف غیبی میں رد کر چکے ہو۔ بہر حال اب اس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔ فقط والسلام۔ والاکرام۔ نجات کا طالب غالب۔ دوشنبہ۔ ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء

۱۰۔ صاحب میں خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ تم اپنے وطن گئے اور عزیزان وطن کو دیکھ کر خوش ہوئے اور مع الخیر والعافیتہ اپنے محسن و مربی کی خدمت میں پھر آ پہنچے۔ نواب صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہنا اور کہنا کہ اس خط میں سلام صرف وفور اشتیاق سے لکھا ہے۔ محبت نامہ جداگانہ جلد بھیجوں گا۔ اجی، ہاں میاں سیف الحسن رامپور سے آ کر تین سو جلدیں درفش کاویانی کی تیار پائیں۔ نواب میر غلام بابا خاں صاحب سے حقہ برادرانہ کو ڈیڑھ سو جلد کا پشتارہ بنایا اس پر ٹاٹ لپٹوایا۔ ڈاک گھر بھجوایا۔ مسترد آیا۔ سرکاری ڈاک والوں نے ہرگز اس کا بھیجنا نہ قبول کیا۔ ٹھیکے والے ہم قلمٹ پاکٹ والے۔ ریل والے متفق اللفظ اس کے ارسال سے انکار کرتے ہیں۔ تم یہ رقعہ حضرت کو پڑھواؤ اور اس باب میں جو وہ فرمائیں وہ مجھ کو لکھو۔ مدعا یہ ہے کہ کسی طرح یہ پشتارہ وہاں تک پہنچ جائے۔ اس خط کا جواب جس قدر جلد لکھو گے مجھ پر زیادہ احسان کرو گے۔ نجات کا طالب غالب۔ پنجشنبہ ۲۳۔ جنوری ۱۸۶۶ء

۱۱۔ صاحب میرا سلام تمہارا خط پہنچا۔ دونوں غزلیں دیکھیں۔ خوش ہوا۔ فقیر شیوہ خوشامد نہیں اور فن شعر میں اگر اس شیوہ کی رعایت کی جاوے تو شاگرد ناقص رہ جاتا ہے۔ یاد کرو کبھی کوئی غزل تمہاری اس طرح کی نہیں ہوئی کہ جس میں اصلاح ہوئی ہو۔ خصوصاً روزمرہ اردو میں۔ دونوں غزلیں لفظاً اور معنیً بے عیب ہیں۔ کسی اصلاح کی حاجت نہیں۔ آفریں صد ہزار آفریں۔ میر غلام بابا خاں واقعی ایسے ہی ہیں جیسا تم لکھتے ہو۔ سیاحت میں دس ہزار آدمی تمہاری نظر سے گذرا ہوگا۔ گروہ کثیر میں جو تم ایک شخص کے مداح ہو تو بے شک وہ شخص ہزاروں میں ایک ہے۔ لاریب فیہ۔ کیا فرمائش کروں اور کیا تم سے منگاؤں۔ وہاں کون کون سی چیز ہے کہ یہاں نہیں۔ آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ انگور سے کم عزیز نہیں۔ لیکن بمبئی اور سورت سے یہاں پہنچنے کی کیا صورت۔ مالدہ کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے۔ اچھا ہوتا ہے۔ کمال یہ کہ وہاں بہت اچھا ہوگا۔ سورت سے دلی آم بھیجنے محض تکلف ہے۔ روپیہ کے آم اور چار روپیہ محصول ڈاک اور پھر سو میں سے شاید دس پہنچیں۔ میرے سر کی قسم کبھی ایسا ارادہ نہ کرنا۔ یہاں دیسی آم انواع واقسام کے بہت پاکیزہ اور لذیذ اور خوشبو افراط سے ہیں۔ پیوندی آم بھی بہت ہیں۔ رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بسبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔ اے لو آج ریل سے ایک بہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی۔ دو لوکرے ہر لوکرے میں سو آم جس کو داروغہ نے یہ سامنے وہ لوکرے کھولے دوسو میں سے تراسی آم اچھے نکلے اور ایک سو سترہ آم بالکل سڑے ہوئے۔ اوائل جون ماہ حال میں ایک ہفتہ مینہ برس کر پھر اب وہی آگ برس رہی ہے اور

تو چل رہی ہے۔ سہ شنبہ ۔ ۱۷۔ جون سنہ ۱۸۸۶ء۔

۱۲۔ صاحب میں تم سے شرمندہ ۔ پہلا خط تمہارا مع قصیدہ پہنچا۔ میں قصیدہ کسی کتاب میں رکھ کر بھول گیا۔ اب دوسرا خط دیکھ کر قصیدہ یاد آیا۔ ہر چند ڈھونڈھا نہ پایا۔ بڑی بات یہ ہے کہ اسی وقت میں نے ان اشعار کو سراسر دیکھ لیا تھا۔ اشعار سب ہموار تھے۔ تم اندیشہ نہ کرو اور قصیدہ تذکرہ گزرا نو اور مع الخیر وطن کو جاؤ۔ لیکن بھائی وطن پہنچ کر ضرور مجھ کو خط لکھنا، اور اپنے گھر کا پتہ لکھنا تاکہ میں اس نشان سے تم کو خط بھیجوں۔ نواب میر غلام بابا خاں صاحب کو فقیر کی طرف سے سلام کہنا۔ فقط صبح سہ شنبہ۔ ۱۸۔ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء۔

۱۳۔ منشی صاحب شفیق بدل مہربان عزیز تر از جان سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ پرسوں نواب صاحب کا خط اور کل تمہارا خط آیا۔ صاحب ٹوپیوں کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے لطائف غیبی کی ۱۵ جلدیں سات روپیے آٹھ آنے دام بھیج کر منگوائیں پھر دو روپیے کے ٹکٹ بھیج کر ٹوپیاں منگوائیں۔ میں نے تمہارے بھیجے ہوئے روپیوں کی ٹوپیاں خرید کر تم کو بھیج دیں۔ چاہو تم پہنو چاہو چھوٹے صاحب کی نذر کرو۔ جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے۔ اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو۔ تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔ لطائف غیبی نے اعدا کی دھجیاں اُڑا دیں۔ ایک نئی بات سُنو۔ محمد میرزا خاں میرے بھائی کا نواسہ ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے۔ مسمٰی بہ اشرف الاخبار۔ اس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں اس کو پڑھ کر معلوم کر لو گے کہ تمہارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھاپا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے۔ ہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ چھوٹے صاحب کی بھی نظر سے گزر جائے۔ اور اس سرکار میں یہ اخبار خرید کیا جائے۔ اور تم ان کی طرف سے حکم خریداری ابتداء جنوری سنہ ۱۸۶۷ء سے بنام محمد میرزا خاں لکھوا اور وہ خط اُس پتہ سے دلی کو روانہ کرو جو ان کے اخبار کے آخر میں لکھا ہے۔ حیران ہوں کہ چھوٹے صاحب کے خط کا کیا جواب لکھوں۔ انھوں نے مجھے شرمندہ کیا۔ اپنے کو چھوٹا اور مجھ کو بزرگ لکھا سید تو سب مسلمانوں کے بزرگ ہوتے ہیں۔ میں تو مسلمانوں میں بھی ایک ذلیل علیل فقیر حقیر آدمی ہوں۔ یہ اُن کی بزرگی۔ اُن کی خوبی اُن کی مہربانی ہے۔ حق تعالیٰ ان کو سلامت رکھے اور ان مقدمات میں کل الوجوہ اُن کو فتح و ظفر نصیب ہو۔ میرا سلام کہنا اور یہ عبارت پڑھا دینا۔ ہاں صاحب برادر بجان برابر میرزا معین الدین حسین خاں بہادر کو میرا سلام کہنا، اور کہنا کہ بھائی میرا جی دیکھنے کو بہت چاہتا ہے پہلے برخوردار شہاب الدین خاں سے پوچھو وہ اجازت دے تو فوراً ریل پیل کرتے چلے آؤ۔ فقط دیدار کا طالب غالب۔ ۷ شوال سنہ ۱۲۸۳ء مطابق ۱۲۔ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء۔

از ادبی خطوط غالب ۔ مرتبۂ جناب میرزا محمد عسکری صاحب

۱۴۔ منشی صاحب سعادت و اقبال نشان سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو دعا۔ صاحب، دہم

اور چیز ہے اور احتیاط اور چیز ہے۔ کارپردازان ڈاک میرے خطوط کے ٹکٹ کبھی نہ دبائیں گے۔ اور
میرے خطوط کبھی نہ تلف ہوں گے۔ آدھ آنے کی جگہ دوست کا ایک آنہ کیوں کھوؤں۔ گلشن، بعض کے نزدیک
مؤنث اور بعض کے نزدیک مذکر ہے۔ قلم۔ دہی۔ خلقت، ان کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی مؤنث کوئی مذکر
بولتا ہے۔ میرے نزدیک دہی اور خلقت مذکر ہے۔ اور قلم مشترک چاہو مذکر کہو چاہو مؤنث۔ گلشن البتہ
مذکر معلوم ہوتا ہے۔ بھائی جہاں الف دبتا ہے میرے کلیجہ میں ایک تیر لگتا ہے۔ "رکھتا ہے گلشن بھی" یہ الف دبتا ہوا
دیکھ کر میں نے "رکھتی ہے" بتا دیا۔ مگر گلشن مذکر مناسب ہے۔ پھلکی یا پھلکا تنہا بے معنی محض ہے۔ ہلکی پھلکی، ہلکا پھلکا
یوں آئے تو درست ہے ورنہ لغو اور یہ جو پھلکا چپاتی کو کہتے ہیں یہ دوسرا لغت ہے۔ پھلکے کبھی کوئی
نہ بولے گا۔ پانی وانی۔ حقہ وقہ یوں کہیں گے۔ ترا وانی اور ترا وقہ نہ کہیں گے۔ ہلکا پھلکا۔ ہلکی پھلکی
کہیں گے۔ مُبک چیز ترا پھلکا یا تری پھلکی نہ کہیں گے۔ تذکیر و تانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ
سے مشورہ لیا کرو۔ اور دبتے ہوئے حروف بھی ان سے پوچھ لیا کرو۔ غالب۔

۵۱۔ بھائی ہم نے تم کو یہ نہیں کہا کہ تم مرزا رجب علی بیگ کے شاگرد ہو جاؤ۔ اور اپنا کلام
اون کو دکھاؤ۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ تذکیر و تانیث کو اُن سے پوچھ لیا کرو۔ دکھن۔ بنگالے کے رہنے والوں کو
اس امر خاص میں دلی۔ لکھنؤ کے رہنے والوں کا تتبع ضرور ہے۔ ایک قاعدہ تم کو معلوم رہے۔ عین کا
حرف فارسی میں نہیں آتا۔ جس لغت میں عین ہو اُس کو سمجھنا کہ عربی ہے۔ بعد معلوم ہونے اس قاعدہ کے
یہ سمجھو کہ غربال، غین نقطہ دار مکسور اور رائے قرشت اور بائے موحدہ اور لام یہ لغت فارسی
ہے۔ ہندی اس کی چھلنی اور مرادف اس کی پرویزن یعنی فارسی میں چھلنی کو غربال اور پرویزن
کہتے ہیں۔ اور چھلنی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو کوئی نہ جانے۔ رہا غربال یا عربال بعین سعفص اور یائے
تحتانی سے فصیح و غیر فصیح کیا بلکہ غلط محض و محض غلط ہے۔ ہاں اگر عربی میں چھلنی کو عربال کہتے ہوں تو
فارسی غربال اور عربی عربال۔ مگر میں ایسا گمان کرتا ہوں کہ غربال کا عربی میں کچھ اور اسم ہوگا۔
عربال نہ کہتے ہوں گے۔ اب تم سنو فن لغت میں ایک امر ہے کہ اس کو تصحیف کہتے ہیں یعنی لفظ کی صورت
ایک ہو اور نقطوں میں فرق جیسا کہ سعدی بوستاں میں کہتا ہے ؎

مرا بوسہ گفتا بہ تصحیف دہ
کہ درویش را توشہ از بوسہ بہ

توشہ و بوسہ۔ نوشہ یہ تین لفظ مصحف ہمدگر ہیں۔ حالانکہ معانی میں وہ فرق کہ جیسا زمین و آسمان
ہیں۔ توشہ ترجمہ زاد کا۔ بوسہ ترجمہ قبلہ کا۔ نوشہ اسم دولہا کا۔ صاحبان فرہنگ میں برہان قاطع والا
تصحیف میں بہت جھلا ہے۔ گذرہ اور گزر۔ خربزہ اور خربزہ؟ کہتا ہے کہ سدا بہ سین سعفص لفظ فارسی
ہے بمعنی آواز اور صدا بہ صاد تعریب ہے۔ جو لغات تے میں لکھے ہیں۔ انھیں لغات کو طوئے میں لکھتا ہے۔ حالانکہ
جس طرح عین فارسی میں نہیں ہے۔ طوئے بھی نہیں ہے۔ مثلاً تشت لغت فارسی الاصل ہے۔ املا اس کی طوئے سے
غلط ہے۔ برہان قاطع والا اس کو تے سے بھی لایا ہے اور طوئے سے بھی۔ محققین جانتے ہیں کہ صدا بمعنی آواز
لغت عربی الاصل ہے۔ نہ معرب اور سدا سین سے ہرگز فارسی میں آواز کو نہیں کہتے ہیں۔ ہاں اردو کے محاورہ میں

بمعنی ہمیشہ کے مستعمل ہے۔ قصہ کوتاہ غربال بمعنی چھلنی کے لفظ فارسی الاصل صحیح و فصیح ہے۔ اور غربال اگر کسی اور فرہنگ عربی میں مثل قاموس اور صراح وغیرہ کے بمعنی چھلنی کے نکلے تو اس کو مانو ورنہ یہ برہان قاطع والے کی خرافات میں سے ہے۔ نجات کا طالب غالب۔ ۲۷۔ فروری۔

۱۹۔ منشی صاحب۔ تمہارے خط پہنچنے کی تم کو اطلاع دیتا ہوں اور مطالب مستفسرہ کا جواب لکھتا ہوں۔ اور اپنے دوست روحانی مرزا رجب علی بیگ سرور کو سلام کہتا ہوں۔ کہہ دیجئے گا۔ بلکہ یہ رقعہ دکھا دیجئے گا۔ بعض لوگ "آن بان" بولتے ہیں مگر فقیر کے نزدیک "آن تان" صحیح ہے اور یہی فصیح ہے۔ "پر" بمعنی "لیکن" لفظ مشہور ہے اور یہ اس کا مخفف ہے۔ اس میں شاید کسی کو کلام نہ ہو۔ کوئی اور لکھے یا نہ لکھے، میرے اردو کے دیوان میں سو دو سو جگہ یہ لفظ آیا ہوگا۔ مجھ کو بنگالے سے آئے ۳۲-۳۳ برس ہوئے۔ بہت احباب مرگئے۔ بہت منفرق ہو گئے۔ اب ایسا وہاں کوئی نہیں جس سے ارسال رسائل کی رسم و راہ ہو۔ صاحب، وہ شعر جس کو تم نے پوچھا ہے یہ ہے ؎

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو　　کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

دو شعر اس غزل کے اور یاد آگئے ہیں وہ دوسرے صفحہ پہ لکھتا ہوں ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب　　آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں　　کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

دیکھو یہ "پر" کا مخفف "پہ" ہے، بمعنی "لیکن"۔ بنارس کا کیا کہنا ہے۔ ایسا شہر کہاں پیدا ہوتا ہے۔ انتہائے جوانی میں میرا وہاں جانا ہوا۔ اگر اس موسم میں جوان ہوتا تو وہیں رہ جاتا اور ادھر کو نہ آتا ؎

عبادت خانۂ ناقوسیانست　　ہمانا کعبۂ ہندوستانست

جس تحریر میں کوئی اسم یا کوئی لفظ نہ آسکے اس کی تدبیر فردوسی اور خاقانی سے بھی نہ ہوگی۔ میں کیا کروں گا۔ نام تمہارا آسکتا ہے۔ لیکن الف دبتا رہتا ہے۔ خدا کے واسطے اس کی تدبیر سرور صاحب سے بھی ضرور پوچھنا۔ نجات کا طالب غالب۔ ۱۲۔ فروری ۱۸۶۱ء۔

ضمیمہ نمبر ۲

سورت کا نواب خاندان

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سے گجرات کے صوبہ داروں اور متصدیوں نے ایک طرف مرہٹوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے اثر و اقتدار اور دوسری طرف مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے سیاسی اُمور میں خود مختاری سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ سورت ان دنوں میں مسلمان متصدیوں، مرہٹوں اور کمپنی کی زور آزمائی کے لئے اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ قریب پچیس تیس سال سورت کی نظامت کے لئے اُمراء آپس میں اس طرح لڑتے رہے کہ کبھی ایک تو کبھی دوسرا متصدی بن بیٹھتا، اور اثر رسوخ سے دہلی سے اپنے نام سند متصدی گری حاصل کر لیتا۔ ان خانہ جنگیوں میں مرہٹے اور کمپنی اُمراء کی مدد کرتے۔

۱۷۳۳ء میں سورت کے قلعہ دار بیگلر خاں کے چھوٹے بھائی تیغ بخت خاں نے کمپنی کی مدد سے کئی سال کی انتھک کوششوں کے بعد سہراب خاں متصدی کو شکست دے کر سورت کی نظامت حاصل کر لی۔ یہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مرکزی حکومت سے آہستہ آہستہ تعلقات منقطع کر لئے، متصدی کے بجائے نواب کا لقب اختیار کیا اور خلافِ معمول اپنے چھوٹے بھائی صفدر خاں کو اپنا نائب مقرر کیا۔ ۱۷۴۶ء تک تیغ بخت خاں نے امن قایم رکھا لیکن ان کے انتقال کے بعد نظامت کا جھگڑا پھر تازہ ہوا جو ۱۷۵۸ء تک جاری رہا۔ آخرکار ۱۷۵۸ء میں تیغ بخت خاں کے داماد سید معین الدین عرف سید اچھن (برہان پور سے سورت آئے تھے) نے کمپنی کی مدد سے سورت کی نظامت حاصل کر لی۔ ۱۷۶۳ء میں سید اچھن کے انتقال پر کمپنی نے ان کے بیٹے حفیظ الدین کو جانشین بنایا۔ ۱۷۹۰ء میں نواب حفیظ الدین کی وفات پر ان کے بیٹے نظام الدین جانشین قرار پائے۔ نظام الدین نے ۱۸۰۰ء میں انتقال کیا۔ ان کا ایک بیٹا تھا جو عہدِ طفلی ہی میں مر گیا، اس لئے ان کے بھائی نصیر الدین کو کمپنی نے اس شرط پر نظام الدین کا جانشین قرار دیا کہ یہ شہرِ سورت کا نظم و نسق کمپنی کے سپرد کر دیں اور محکمۂ عدالت اپنے پاس رکھیں اور اس کے عوض ایک لاکھ روپیہ وظیفہ اور شہر کے محصول کا پانچواں حصہ لیں۔ نواب کو اس قسم کے معاہدے پر دستخط کئے بغیر چارہ نہ تھا، کیونکہ مرکزی حکومت کا عمل دخل ختم ہو چکا تھا، اور حقیقت میں کمپنی نواب گر تھی۔ ۱۸۲۱ء میں نواب نصیر الدین کے انتقال پر کمپنی نے ان کے بیٹے افضل الدین کو جانشین قرار دیا، لیکن محکمۂ عدالت بھی ان سے لے لیا۔ افضل الدین کی شادی سورت کے

ایک کروڑپتی تاجر زبدۃ التجار شیخ صالح چلپی (چلپی ہونا چاہیئے) کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ ان کے اولادِ نرینہ نہیں تھی۔ اس بیگم کے بطن سے صرف دو لڑکیاں تھیں۔ ۱۸۳۱ء میں دہلی سے مرزا کام بخش اپنے بیٹوں مرزا ہمایوں اور مرزا نجف کے ہمراہ سورت آئے تھے۔ ان دونوں شہزادوں کی نسبت افضل الدین کی مذکورہ دونوں لڑکیوں سے ہوئی تھی لیکن ان تیموری شہزادوں نے نواب کی دولت اس بے دردی سے صرف کرنا شروع کیا کہ نواب پریشان ہوگئے اور شہزادوں کو دہلی روانہ کردیا۔ ۱۸۳۴ء میں ان لڑکیوں کی شادی بڑودے کے میر سرفراز علی کے بیٹوں میر اکبر علی خاں اور میر جعفر علی خاں سے ہوئی۔ یہ سرفراز علی خاں کا اصل وطن سہسوان ضلع بدایوں تھا۔ لیکن بڑودہ آکر اپنی غیر معمولی سیاست دانی اور فوجی لیاقت کی وجہ سے ریاست گائکواڑ میں سلحدار سردار کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ میر صاحب ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھی معتمد سرداروں میں سے تھے۔ میر صاحب نے بڑودہ کے نواب خاندان میں شادی کرلی اور راقم الحروف کے ایک بزرگ سید عبدالقادر (ریاست میں پہلے سے فوجی افسر تھے) سے ایک قطعہ زمین خرید کر اپنی حویلی بھی تعمیر کرائی۔ آج بھی یہ حویلی میر صاحب کے باڑے کے نام سے مشہور ہے۔ انہیں کے پوتے میر ابراہیم علی خاں متخلص وفا خلف میر اکبر علی خاں، غالب کے گجراتی شاگردوں میں تھے۔

میر سرفراز علی خاں کے انتقال کے بعد منصب سلحداری میر اکبر علی خاں کے نام منتقل ہوگئی یہ سورت سے بڑودہ چلے گئے اور میر جعفر علی خاں اپنی سسرال ہی میں رہے۔ میر سرفراز علی خاں کے تیسرے بیٹے میر باقر علی خاں تھے۔ ۱۸۴۲ء میں نواب افضل الدین کے انتقال کے بعد کمپنی نے میر جعفر علی خاں کو جانشین تو مان لیا لیکن وظیفہ کی رقم نصف کردی۔ میر جعفر علی خاں نے سنہ میں ولایت جاکر اپنا قضیہ ڈائرکٹروں کے سامنے پیش کیا۔ ان کے ہمراہ منشی لطف اللہ فریدی بطور ترجمان اور حکیم بدرالدین طبیب کی حیثیت سے گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں کمپنی نے ان کا وظیفہ دوبارہ ایک لاکھ کردیا۔

میر جعفر علی خاں نے تین شادیاں کی تھیں۔ ایک بیوی سے ایک فرزند میر ذوالفقار علی خاں تھے دوسری بیوی سے دو لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکی (بڑی بیگم) کی شادی نواب بیلہ کے خاندان میں ہوئی تھی اور دوسری لڑکی رحیم النساء (چھوٹی بیگم) کی شادی ۱۸۵۹ء میں میر غلام بابا خاں سے ہوئی تھی۔ میر ذوالفقار علی خاں کے تین لڑکوں میں سے اس وقت سب سے چھوٹے میر غلام قادر صاحب (دربار کمڈھیا) بقیدِ حیات ہیں۔ غلام قادر صاحب کے بھی تین بیٹے ہیں جو زیورِ علم سے آراستہ ہیں۔

میر جعفر علی خاں نے ۱۸۶۳ء میں انتقال کیا۔ ان کے بعد وظیفہ ان کی اولاد میں تقسیم کردیا گیا۔ میر جعفر علی خاں نہایت قوی ہیکل اور طاقتور شخص تھے۔ منشی لطف اللہ نے اپنی سوانح عمری میں لندن سے واپسی پر سفر کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ جب نواب صاحب کی سواری کے لئے گدھا لایا گیا تو انہوں نے گدھے کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا لیا اور کہا کہ جس کو میں اٹھا لیتا ہوں وہ میرا بوجھ کیسے اٹھا کر چلے گا!

غلام بابا خاں :۔ میر غلام بابا خاں سورت کے ایک مشائخ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ایک بزرگ شرف الدین حنفی ہندی بارہویں صدی ہجری کے نصف اول میں سورت میں منصب قضاۃ پر فائز تھے شرف الدین کا

شادی سورت کے ایک جیّد صوفی خواجہ سید جمال الدین نقشبند کے خاندان کے چشم و چراغ مولانا فیض الحسن کی دختر سے ہوئی تھی۔ چونکہ مولانا فیض الحسن کے اولاد نرینہ نہیں تھی اس لئے قاضی شرف الدین کے فرزند اور مولانا فیض الحسن کے نواسے ابوالحسن متوفی ۱۱۶۴ھ قضات کے علاوہ سجادہ نشین خانقاہ خواجہ جمال الدین بھی قرار پائے قاضی ابوالحسن کے انتقال پر ان کے بیٹے محمد حسین متوفی ۱۲۳۵ھ جانشین ہوئے۔ قاضی محمد حسین کے چار بیٹے مظفر حسین سید اقی۔ غلام نقشبند اور بہاؤ الدین تھے۔ مظفر حسین اپنے والد کے بعد منصب قضاۃ پر فائز ہوئے اور سجادگی خانقاہ دوسرے بیٹے سید اقی کے تفویض کی گئی۔ سید اقی کے بھی چار بیٹے جمال الدین۔ غلام بابا۔ سید مصطفیٰ اور فیض الحسن تھے۔ بڑے بیٹے سید جمال الدین والد کے جانشین مقرر ہوئے۔ ۱۲۹۴ھ میں سید جمال الدین کا انتقال ہوگیا تو ان کے بیٹے سید اقی (دوم) کو منصبِ قضاۃ تفویض ہوئی اور یہی سجادہ نشین خانقاہ بھی مقرر ہوئے۔

میر غلام بابا ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر چودہ سال کی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ لہذا غلام بابا اور ان کے دوسرے دو بھائیوں نے اپنے بڑے بھائی سید جمال الدین کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ غلام بابا نے ابتدائی پانچ چھ سال اپنے والد سے تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد سورت کے ایک عالم مولوی کاظم صاحب کے سامنے زانوے ادب تہ کیا لیکن چند سال کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

۱۲۷۲ھ کے لگ بھگ غلام بابا کی نسبت میر جعفر علی خاں کی بیٹی رحیم النساء بیگم (چھوٹی بیگم) سے اور ۱۲۷۶ھ م ۱۸۵۹ء میں بڑی دھوم سے شادی ہوئی۔ شادی کے بعد سے غلام بابا اپنی سسرال نواب باڑی میں مستقل طور پر رہنے لگے۔ ۱۸۶۳ء میں میر جعفر علی خاں کا انتقال ہوگیا تو وظیفہ اعزہ میں تقسیم کردیا گیا وظیفے کا ایک حصہ غلام بابا خاں کو بھی ملتا رہا۔ آج تک یہ وظیفہ حکومتِ ہند کی طرف سے غلام بابا خاں کے پڑپوتے میر غلام غوث کے نام جاری ہے۔

غلام بابا نہایت حلیم الطبع، متواضع، ہر دلعزیز، علم دوست رئیس تھے۔ ان کی کشادہ دلی اور فیاضی سے بے شمار لوگوں نے فایدہ اٹھایا ہے۔ ان کی داد و دہش دور دور تک مشہور تھی۔ اکثر اہل ذوق ان سے تقرب حاصل کرنے کے خواہاں رہتے اور اس غرض سے ان کی اور سیاح کی شان میں قصیدے لکھ کر بھیجتے۔ ہر غریب امیر سے اس کے درجے کے مطابق ملتے اور بہت ہی لطف و کرم سے پیش آتے۔ عید کے دن بھی ہر ایک شخص کو بلا امتیاز اپنے ہاتھ سے شربت کا فنجان پیش کرتے۔ راقم کے دادا سید نصیر الدین سورتی جمعدار سے نواب صاحب موصوف کے تعلقات خصوصی تھے۔ انھوں نے اپنا معمول بنالیا تھا کہ ہفتے میں دو بار دادا صاحب قبلہ کے ساتھ غریب خانہ پر ماحضر تناول فرماتے۔ ۱۸۶۵ء میں غلام بابا خاں نے پارچہ بافی کا ایک میل کھولا تھا۔ یہ غلام بابا میل کے نام سے مشہور تھا۔ شہر سورت میں جعفر علی خاں میل کے نام سے بھی ایک کارخانہ مشہور تھا۔ یہ پتہ نہ چلا کہ مذکورہ کارخانہ نواب صاحب کا تھا، یا کسی اور نے ان کے نام سے موسوم کیا تھا۔ غلام بابا خاں عوام کی سماجی و تعلیمی، اصلاحی تحریکوں میں بھی حصہ لیتے تھے حکومت ہند کی جانب سے انھیں C. I. E. کا خطاب بھی ملا تھا۔

سورت کے اس نامور رئیس نے ۶۰ سال کی عمر میں ۱۳۱۰ھ م ۱۸۹۳ء میں ۱۲ شوال کو رحلتِ آخرت

لہ راقم کی والدہ کے خالو تھے۔

باندھا۔ جنازہ میں سچین، بڑودہ، بھروچ، احمد آباد کے اکابر اور سورت کے امیر غریب شریک تھے۔ نمازِ جنازہ خانقاہ خواجہ سید جمال الدینؒ میں ادا کی گئی اور وہیں ان کے موروثی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

غلام بابا نے دوسری شادی احمد آباد کے ہاشمی خاندان کی ایک لڑکی بستی بیگم سے کی تھی، لیکن ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ چھوٹی بیگم کے بطن سے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑے بیٹے میر مظفر حسین خاں اپنے والد کی طرح نہایت خلیق و حلیم الطبع رئیس تھے۔ راقم نے انھیں اپنے بچپن میں دیکھا ہے[1]۔ دوسرے بیٹے میر جعفر علی خاں تھے۔ سنہ ۱۲۸۰ھ م ۱۸۶۳ء میں اس فرزند کی ولادت پر غالب نے قطعہ تاریخ لکھ بھیجا تھا اور مہابت خاں نام بھی تجویز کیا تھا۔ غلام بابا کی بیٹی بسم اللہ بیگم سنہ ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں ان کی رسم بسم اللہ کی تقریب پر قطعۂ تہنیت غالب نے لکھ بھیجا تھا۔ (حقیقت السورت۔ تاریخ گجرات از عبد روس)۔

ریاست سچین کا نواب خاندان

ریاست سچین سورت سے نو میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ اس کا رقبہ ۴۲ مربع میل تھا، اور یہ ۱۲ گاؤں پر مشتمل تھی۔ اس کے پہلے نواب نواب سیدی عبدالکریم محمد یاقوت مبارز الدولہ نصرت جنگ عرف بالو میاں تھے۔ یہ حبشی بحری سرداروں میں سے تھے۔ ان کے بزرگ ہندوستان کب آئے اس کا علم نہیں۔ لیکن اس خاندان کے افراد احمد نگر اور بیجاپور کے بحری بیڑوں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور عہدِ عالمگیر میں بھی امیر البحر کا درجہ رکھتے تھے۔ اس خاندان کی ایک شاخ نے جزیرہ (جنجیرا۔ قریب بمبئی) کو صدر مقام بنا کر حکومت قائم کر لی تھی۔ نواب بالو میاں، بانیِ ریاست سچین دراصل جزیرہ کے نواب تھے۔ مگر آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے انھیں جزیرہ چھوڑ دینا پڑا۔ نواب بالو جزیرے کا قبضہ حاصل کرنے کے خیال سے پیشوا سے مدد مانگی، مگر چونکہ مرہٹوں کو اکثر ان بحری سرداروں کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی اس لئے فریقین کو ناراض نہ کرتے ہوئے نواب بالو کو سورت کے قریب (۱۲ گاؤں) دے کر ریاست کے جزیرہ پر سے اپنا حق اٹھا لینے کو کہا گیا۔ نواب بالو نے یہ منظور کر لیا۔ اس طرح سنہ ۱۷۹۱ء میں ریاست سچین وجود میں آئی۔

نواب بالو گیارہ سال دادِ عیش دے کر سنہ ۱۸۰۲ء میں انتقال کر گئے۔ انہیں شعر و سخن سے شغف تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ کریم تخلص تھا۔ نواب بالو کے بعد ان کے بڑے بیٹے سید ابراہیم خاں جانشین ہوئے۔ نواب ابراہیم خاں بڑے فیاض اور غریب پرور رئیس تھے۔ ان کے ۲۵ لڑکے اور کچھ کم لڑکیاں تھیں۔ قریب سو کی عمر میں سنہ ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔ موصوف کو شعر و سخن سے بے حد شغف تھا۔ خود بھی شاعر تھے۔

---

[1] مظفر حسین صاحب نے سنہ ۱۹۳۲ء میں انتقال کیا۔ ان کے بیٹے میر حفیظ الدین میں بھی خاندانی خصوصیات موجود تھیں۔ سنہ ۳۵ سے سنہ ۴۰ تک یہ مسلم لیگ کے ایک جانباز سپاہی رہ چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں انتقال کیا۔ مرحوم کے ایک بیٹے میر غلام غوث بمبئی میں متمکن ہیں اور دوسرے بیٹے میر وزیر صاحب نے حیدر آباد میں مستقل اقامت اختیار کر لی ہے۔

محب تخلص کرتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ یوسف زلیخا کا اُردو اور بدرِ منیر کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا (حدیقۂ احمدی) ہر ہفتہ محل میں مجلسِ مشاعرہ گرم ہوتی اور اس کے بعد رقص و سرود کا سلسلہ رہتا۔

نواب سیدی ابراہیم خاں کے بعد ان کے فرزندِ اکبر سیدی عبدالکریم خاں دوم جانشین ہوئے۔ نواب کے ایک بھائی سیدی عبدالرحیم خاں عرف سید و میاں ادب نواز رئیس تھے۔ نہایت پُرگو شاعر تھے۔ اخلاص تخلص تھا۔ ان کا دربار ہمیشہ شعراء سے بھرا رہتا تھا۔ میاں سمجھو سورتی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ جرأت کے شاگرد میاں مجبور بھی ان کی سرکار سے متسلک تھے۔ ۱۸۶۹ء میں نواب سیدی عبدالکریم خاں دوم کے بعد ان کے بیٹے سیدی ابراہیم خاں دوم جانشین ہوئے۔ نواب صاحب کے ایک بھائی سیدی عبدالغنی شاعر تھے۔ غنی اور سالار تخلص کرتے تھے۔ منشی سیاح سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ غنی نے بمبئی میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی۔ ۱۸۸۴ء میں یہیں انتقال کیا۔ وفات سے ایک روز پیشتر بمبئی احباب سے مفارقت کا ماتم نظم کیا تھا۔ یہ ایک طویل طویل نظم ہے۔

۱۸۷۳ء میں نواب سیدی ابراہیم خاں کی وفات پر ان کے بیٹے سیدی عبدالقادر جانشین ہوئے اور نواب سیدی عبدالقادر کے بعد ان کے فرزندِ اکبر سید ابراہیم خاں سوم جانشین ہوئے۔ نواب ابراہیم خاں نے ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں حکومت برطانیہ کی طرف سے قابلِ قدر خدمات انجام دی تھیں۔ ــــــ میں موصوف نے وفات پائی۔ فی الحال نواب صاحب کے فرزند اکبر نواب سیدی حیدر خاں بہ قیدِ حیات ہیں۔ (امپریل گزیٹر، تاریخ گجرات از سید عبدالرحمٰن عیدروس)۔

حکیم شیخ محمد میاں: ــ شیخ محمد میاں سورت کی پٹنی جماعت کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۸۵۰ء میں بمقام سورت پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد سورت میں حکیم عبدالرزاق رامپوری سے طب سیکھی۔ ۱۸۷۵ء تک عبدالرزاق کے ہاں حاضری دیتے رہے لیکن اس کے بعد اپنا علیحدہ مطب قائم کیا۔ قریب ۳۵ سال خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ موصوف سورت کے حاذق طبیبوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ چونکہ منشی سیاح حکیم عبدالرزاق کے دوستوں میں تھے، اس لئے محمد میاں صاحب سے بھی سیاح کے مراسم تھے۔ سیاح پر جب بُرا وقت پڑا تو محمد میاں صاحب نے حقِ رفاقت ادا کر دیا۔ قیدخانہ سے لوٹنے کے بعد سورت میں سیاح کو مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ شیخ محمد میاں صاحب نے انہیں اپنے ہی ایک مکان میں ٹھہرنے کا انتظام کر دیا تھا۔

حاجی حکیم محمد قاسم، حکیم محمد میاں صاحب کے بڑے بیٹے ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ سورت میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طبیہ کالج دہلی سے سند حاصل کی اور اپنے والد کے مطب کو جاری رکھا۔ موصوف بھی سورت کے حاذق طبیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ محمد قاسم صاحب نے ۲۵ ــ ۳۰ سال پرکٹس کرنے کے بعد سلسلۂ مطب موقوف کر دیا اور اس وقت بحیثیت (Consultant) خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اللہ نے ہاتھ میں شفا اور زبان میں مٹھاس دی ہے اس لئے آج بھی آفریقہ، رنگون اور ہندوستان کے مختلف حصوں سے زندگی سے مایوس مریض آتے ہیں اور شفایاب ہو کر جاتے ہیں۔ موصوف کو ریسرچ کا بے حد شوق ہے۔ باوجود علالت کے روزانہ کئی گھنٹے اپنی تجربہ گاہ میں مصروف کار نظر آتے ہیں۔ بارہ پندرہ سال ہوئے سورت میں "معین الصحت" کے نام سے ایک دواخانہ (فارسی) قایم کیا ہے جہاں موصوف کی زیر نگرانی سائنٹفک طریقہ پر ادویہ تیار کی جاتی ہیں۔ غرضیکہ حکیم صاحب اس فن شریف کی علمی و عملی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

حکیم صاحب نے سیاح کو اپنے بچپن میں دیکھا ہے۔ سیاح ان سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ محمد قاسم صاحب کے چھوٹے بھائی حکیم حافظ غلام محمد صاحب فارسی کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ انہیں سیاح کی اہلیہ عارف بی بہت چاہتی تھیں۔ عارض بی نے سیاح کے کاغذات دیوان وغیرہ انہیں کے حوالے کر دئیے تھے جو ان کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

سید حمید الدین سورتی جمعدار:۔ سید حمید الدین دکن کے ایک خاندان سادات قادریہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاندان کے بزرگ سلاطین بیجاپور اور سرکار پیشوا کے لشکر میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں جب گجرات پر مرہٹہ یورشوں کا آغاز ہوا، اس وقت اس خاندان کے ایک بزرگ سید ولی فوجی افسر کی حیثیت سے مرہٹوں کے ساتھ گجرات آئے۔ چونکہ ۱۷۱۹ء میں پلاجی راؤ بانی ریاست گائیکواڑ نے سونگڑھ (قریب سورت) کو صدر مقام بنا کر گجرات میں حکومت کی داغ بیل ڈالی اور لشکر بھی یہاں مستقل رہنے لگا تو سید ولی نے بھی یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ انہیں سورت کے قریب جاگیر بھی دی گئی تھی۔ ۱۷۶۶ء تک حکومت گائیکواڑ مستحکم ہو چکی تھی اور بڑودہ اس کا صدر مقام قرار پایا تھا۔ اس ریاست کے حکمران گوندراؤ گائیکواڑ (۱۷۹۳ء تا ۱۸۰۰ء) پونا سے بڑودہ آئے تو لشکر کی از سر نو تنظیم کی۔ اس میں عرب بیڑے بھی تھے جس کے افسر عرب جمعدار کہلاتے تھے۔ ایسے ہی ایک عرب بیڑے کے جمعدار سید ولی کے پوتے سید محمد عرب سید میاں تھے۔ سید محمد کی شادی ایک سلحدار سردار سید عبدالقادر[1] کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ سید عبدالقادر گوندراؤ مہاراج کے ساتھ پونا سے بڑودہ آئے۔

---

[1] سید عبدالقادر شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کے خاندان سے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ سید عبدالقادر بن سید غلام علی عرف سید ابو بن سید عبدالقادر بن سید ابو (اول) بن شاہ محمد بن شاہ وجیہ الدین۔ ان کے جد اعلیٰ سے شیخ احمد مدنی کی ایک بیٹی منسوب تھیں۔ اسی طرح سید ولی کی پوتی شیخ احمد مدنی کے ایک بیٹے محمد ہاشم سے منسوب تھیں۔ جب شیخ احمد مدنی کی اولاد میں سورت میں کوئی باقی نہ رہا تو عبدالقادر خانقاہ مدنی کے سجادہ نشین مقرر ہوئے تھے اسی مناسبت سے سید عبدالقادر مدنی کہلاتے تھے۔ سید عبدالقادر کو گائیکواڑ کی طرف سے پائیگاہ کے خرچ کیلئے انکلیول گاؤں دیا گیا تھا۔

سنہ ۱۷۹۹ء میں گجرات میں پیشوا کے نمایندے ابا شلوکر اور گایکواڑ کے درمیان بمقام احمد آباد ایک جنگ ہوئی تھی، اس میں سید عبدالقادر اور ان کے بیٹے سید ولی الدین شریک تھے۔ اس جنگ میں بڑودہ کے نواب نصیر الدین اور سید ولی الدین کام آگئے۔ چونکہ سید ولی الدین، سید عبدالقادر کے اکلوتے بیٹے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے نواسے سید فخر الدین عرف بنو میاں ولد سید محمد عرف سید میاں کو اپنا جانشین قرار دیا۔ اس طرح سنہ ۱۸۱۳ء میں سید عبدالقادر کی وفات کے بعد منصب سلحداری پایگاہ جاگیرات وغیرہ سید فخر الدین کے نام منتقل ہو گئیں۔ سید عبدالقادر، شیخ احمد مدنی[1] کی خانقاہ کے سجادہ نشین بھی تھے۔ لہٰذا ان کے بعد فخر الدین کو مسندِ سجادگی پر بھی بٹھلایا گیا۔ چونکہ سورت میں سلسلۂ پیری مریدی قایم تھا اس لئے فخر الدین زیادہ وقت سورت میں رہتے تھے۔ اسی وجہ سے یہ خاندان سورتی جمعدار کے نام سے مشہور ہے۔

فخر الدین نے سنہ ۱۸۵۹ء میں بہ عمر (۶۳) سال انتقال کیا۔ ان کے بعد سرکار گایکواڑ کی طرف سے منصب پایگاہ وغیرہ کو ان کے دونوں بیٹوں سید کمال الدین اور سید نصیر الدین کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ کمال الدین سب سے بڑے بیٹے تھے، اس لئے سجادہ نشینی بھی انہیں کے تفویض کی گئی۔ اگرچہ اس وقت کمال الدین کا عہد جوانی تھا، لیکن کسی مرشدِ کامل کی توجہ نے ان کی طبیعت میں تغیر پیدا کر دیا۔ لہٰذا تین چار سال کے بعد ہی سرکاری حاضری موقوف کر کے اہل اللہ کی صحبتوں میں حاضری دینا شروع کر دیا، اور (۴۳) سال کی عمر میں سنہ ۱۸۶۴ اور سنہ ۱۸۶۶ء کے درمیان حیدر آباد چلے گئے۔ حیدر آباد میں افضل الدولہ نظامِ خامس ان کے بہت معتقد تھے[2]۔

کمال الدین نے سنہ ۱۸۸۲ء میں بمقام حیدر آباد انتقال کیا۔ ان کی اولاد ایک بیٹی اور تین بیٹے تھے، جو بعد میں سورت چلے آئے۔ ان کے بڑے بیٹے سید ولی الدین بھی صوفی منش تھے۔ انہیں صرف خاص سے تاحیات وظیفہ ملتا رہا۔

نصیر الدین اپنے بھائی کمال الدین سے قطعاً برعکس تھے۔ سورت میں سجادہ نشینی اور پیری مریدی کے سلسلہ کو یک لخت یہ کہہ کر منقطع کر دیا کہ وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر عملی زندگی اور نصب العین

---

[1] شیخ احمد مدنی، شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں ہیں (شجرہ نامہ دیکھئے تذکرۃ الالباب اور روضۃ الاولیاء) شیخ احمد کے والد مولانا عیسیٰ مدنی اپنے زمانہ کے عالمِ متبحر و درویشِ کامل تھے۔ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی سے بیعت و خلافت حاصل تھی۔ سنہ ۱۰۶۸ سے کچھ پہلے بمقام احمد آباد انتقال کیا۔ مزار محلہ خانپور میں ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کی طرف سے ان کے خاندان کی مدد معاش کے لئے احمد آباد بھروچ، وانکلیشور وغیرہ میں کئی ہزار بیگھے زمین بطور وظیفہ دی گئی تھی۔ شیخ احمد مدنی نے سورت میں مستقل اقامت اختیار کر لی تھی۔ سورت میں یہ عہدۂ قضاۃ پر بھی فائز تھے۔ سنہ ۱۱۰۹ کے آس پاس انتقال کیا۔ ان کی اولاد میں چھ بیٹیاں اور چار بیٹے تھے۔ ان کے بیٹے کا سورت میں انتقال ہوا، اور تین بیجاپور اپنے چچا زاد بھائی بتیرہ پھوپی خلیل الرحمٰن کے پاس چلے گئے تھے، اور وہیں شادیاں کر لی تھیں۔ شیخ احمد مدنی کے چھوٹے بھائی ابو الحسن، عالمگیر کے لشکر میں قاضی تھے۔ سنہ ۱۰۹۷ میں انتقال کیا۔ انکے فرزند اکبر مولانا خلیل الرحمٰن بیجاپور کے صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے۔ خلیل الرحمٰن کے بعد ان کے بیٹے مولانا اکرم صدر الصدور مقرر ہوئے تھے۔ یہ بھی اپنے وقت کے جید علماء میں شمار کئے جاتے تھے۔ خلیل الرحمٰن کے دوسرے بھائی شاہ شیخن شطاری بھی عالم اور مرشدِ کامل گذرے ہیں۔ اورنگ آباد میں آپ کا مزار ہے۔

[2] کمال الدین کے اہل و عیال کے کہنے کے مطابق افضل الدولہ ان کے بچوں کو جب حضور یاد کرتے تو اپنے ہاتھ سے طلائی سکوں سے بھری ہوئی طشتریاں ان کے سامنے پیش کرتے۔

خدمت الناس تھا۔ سر سید کی تحریکوں سے بہت متاثر تھے۔ مگر انہیں انگریزوں سے دلی نفرت تھی۔ صرف سرکاری تقاریب کے وقت بڑودہ جاتے تھے۔ اور زیادہ وقت سورت میں اصلاحی و تعلیمی ترقیوں کی حتی الامکان جد و جہد کرتے رہتے۔ انہیں اردو زبان و ادب سے بھی بہت محبت تھی۔ ۱۸۸۵ء میں سید زین العابدین دس اور دوسرے ہمدردانِ قوم کو ساتھ لیکر "انجمنِ اسلام" کے نام سے ایک انجمن قایم کی تھی جو آج تک خدمت انجام دے رہی ہے۔ ان کی حویلی ایک قسم کی غیر سرکاری عدالت تھی۔ اہلِ سورت اپنے تصفیے ان کے سامنے لاتے اور ان کے فیصلے کو قطعی مانتے۔ ان کی اس خدمت نے سینکڑوں گھروں کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا۔

میر جعفر علی خاں اور میر اکبر علی خاں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے لیکن میر غلام بابا خاں اور منشی سیاح سے ان کے بہت گہرے تعلقات تھے۔ ۱۹۱۳ء میں بہ عمر (۸۵) سال انتقال کیا۔ ان کی اولاد میں دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔

حمید الدین، نصیر الدین کے منجھلے بیٹے ہیں۔ ان کا سنہ ولادت ۱۸۷۰ء ہے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سورت کے ایک عالم مولوی محمود سے فارسی عربی پڑھی، اس کے بعد حکیم عبدالرزاق رامپوری سے طب سیکھنی شروع کی لیکن یہ سلسلہ زیادہ وقت قائم نہ رہا، انگریزی کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو سورت کے گورنمنٹ اسکول اور آئی۔ پی مشن اسکول میں انگریزی تعلیم حاصل کی میٹرک تک پہونچ چکے تھے، مگر اس زمانے کی رنگین صحبتوں کی کشش نے سلسلۂ تعلیم ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیا۔ قریب آٹھ دس سال دادِ عیش دیتے رہے۔ اسی دوران میں ان کے ایک ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست نواب محمد عالم کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا۔ ادھر ان کے لئے محفلیں بے رونق ہو گئیں، ادھر ان کے والد نے کچھ اس انداز میں چشم نمائی کی کہ خود دار طبیعت کو ٹھیس لگ گئی اور اپنے پسینے کی کمائی کے خیال سے ملازمت کی ٹھان لی۔ ۱۹۰۱ء میں ریلوے میں ملازم رہ گئے اور اپنے والد کے انتقال کے بعد اگرچہ ذمہ داریاں دہ چند ہو گئی تھیں لیکن ملازمت نہیں چھوڑی۔ آخر بیس سال کے بعد نجی ذمہ داریوں کی وجہ سے ملازمت چھوڑ کر سورت چلے آئے، اور اس دن سے آخر عمر تک خدمت الناس کے لئے زندگی وقف کر دی۔ ۱۹۲۱ء کے بعد سے (۲۵) سال کئی انجمنوں کے اعزازی ناظم کی حیثیت سے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ سیاسی، سماجی تحریکوں میں ہر ممکن طریقہ پر حصہ لیتے رہے مگر ان کی دلی آرزو یہ تھی کہ سورت میں ایک ایسا اسکول قائم کیا جائے جس کا ذریعۂ تعلیم اردو اور مذہبی تعلیم فرض ہو کئی سال کی انتھک کوششوں کے بعد یہ آرزو بر آئی اور ۱۹۳۸ء میں ایک انگلو اردو اسکول قائم کرنے میں کامیاب ہوئے (آج یہ اسکول نہایت کامیابی سے چل رہا ہے)۔ آخری آٹھ نو سال عبادت و ریاضت میں گذار کر ۱۹۵۱ء کی ۲۱ نومبر کو میدانِ عمل کے اس جانباز سپاہی نے دنیا سے کوچ کیا۔

خود داری، راست گفتاری اور حق طلبی موصوف کی قابلِ ذکر خصوصیات ہیں۔ قوم سے انہیں بے حد محبت و ہمدردی تھی بعض اوقات اپنی قوم کی تعلیمی و معاشرتی پستی کا ذکر کرتے تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے۔ جس کام کا بیڑہ اٹھاتے اس کے پیچھے دیوانہ وار سرگرداں رہتے۔ علم و ادب سے انہیں خاص لگاؤ تھا کتب بینی کا شوق جنون کی حد تک تھا عہدِ جوانی میں شعر بھی کہتے تھے، حشمت تخلص تھا۔ انہیں منشی سیاح کی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا تھا، ابتدا میں انہیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ آغا شاعر سے بھی نیاز حاصل تھا علم موسیقی سے بے حد شغف تھا۔
[illegible] تھی۔ ان کی اولاد میں ایک بیٹی اور تین بیٹے ہیں۔ راقم الحروف ان کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔
([illegible] کے سلحدار سرداروں کا اتہاس۔ روضۃ الاولیاء۔ خاندانی دستاویز)